کردار

از

ماہر القادری

اس تصویر میں یہ دکھایا گیا
تھا کہ ایک نوجوان عورت جس کا
سینہ کھلا ہوا تھا اور رانیں نصف
سے زیادہ عریاں تھیں، اور وہ ایک
پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی اور ایک مرد
پیچھے سے اس کے شانوں کو سہلا رہا تھا
عورت، مرد کے ہاتھوں کے
لمس کو محسوس کر کے مسکرا رہی تھی
جیسے مرد اس کے جسم کو نہیں چھو رہا تھا بلکہ [illegible]
کیف آور
زنانہ چٹکیاں دے رہا ہے

ادارہ اشاعت اردو
حیدرآباد (دکن)

ملنے کا پتہ: کتاب محل چار کمان حیدرآباد دکن

تعداد طبع ایک ہزار

فروری سنہ ۱۹۴۴ء

مطبوعہ

رزاقی مشین پریس
حیدرآباد دکن

اپنے اس شعر کے نام

ے روز و شب کی فطرت جو بدل سکو بدل دو

کہ نہیں قبول مجھ کو مہ و مہر کی غلامی

ماہر القادری

دو لفظ

اردو زبان میں ناول نگاری مصنوعی کرداروں سے شروع ہوئی۔ تاریخی کرداروں سے گزری عام انسانوں کے حالات پر بھی کوئی نہ کوئی ناول مل ہی جائے گا لیکن کردار پیش کرنیوالے ناول ابھی تک کمیاب نہیں بلکہ نایاب ہیں —— اہل ادب چاہے ناول کی منطقی تعریف کچھ بھی کریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے کردار کی نوعیت کیساتھ ناول، بلکہ سارے ادب کا موضوع ہے۔

شاعر حیات ماہر القادری جس کے حیات انگیز نغمے ادارۂ اشاعت اُردو محسوسات اور نغمات کے ذریعہ پیش کرچکا ہیں، اس کتاب میں "کردار" انسانی کے روپ انوپ دکھاتا ہے۔ آنکھیں بہت کچھ دیکھتی ہیں، اور دماغ بہت کچھ سوچتا ہے، لیکن نہ سب کچھ یاد رہتا ہے، اور نہ

سب آنکھیں اور سب دماغ یکساں دیکھ و سوچ سکتے ہیں۔ شاعر حیات کا دل، شاعر کا دل، دماغ شاعر کا دماغ اور قلم صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ادیب و شاعر کا مشترک قلم ہے، کردار نگاری میں جو کمال قلم نے دکھایا ہے اس کا نمونہ اس کتاب میں آپ کو ملے گا۔

کردار میں آپ کو پاکیزہ محبت، دلچسپ افسانویت تہذیب نو پر پُرلطف تنقید اور سماج کی واضح اور سچی تصویر سب کچھ ملے گا، اور اس طرح ملے گا کہ پڑھنے کے بعد آپکو ماحول کے مطالعہ میں زاویہ نظر بدلنے کی ضرورت محسوس ہو گی، ساری باتیں زمینی اور آپ ہی کے ماحول کی ہیں صرف مطالعہ کا انداز جدا ہے اور لکھنے کا طرز دلچسپ بھی اور انوکھا بھی،

محمد اقبال سلیم گاہندری

قیصر پور

قیصر پور ایک متوسط درجہ کا قصبہ تھا جس کی آبادی آٹھ ہزار کے لگ بھگ تھی، یہہ قصبہ ریلوے اسٹیشن سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر واقع تھا ریلوے اسٹیشن سے قیصر پور تک پکی سڑک تھی، دور حاضر کی مہذب آبادی، نام ہے، خوشنما بنگلوں، کشادہ اور مصفا سڑکوں، باغچوں، تھیٹر ہالوں، رقص خانوں اور کھیل کے میدانوں کا، اس اعتبار سے قیصر پور، ایک بڑے گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا، پرانی وضع کے مکان، اور کچی سڑکیں، اس قصبہ کی کائنات تھیں۔ البتہ بازار کی سڑک پختہ بنی ہوئی تھی جس پر وہاں کے دوکانداروں نے اپنی مہربانی سے جابجا، بڑی بڑی لالٹین نصب کر دی تھیں۔ قیصر پور کے رہنے والوں کے لیئے یہہ سڑک دہلی کے چاندنی چوک، اور لاہور کی مال روڈ سے بھی بڑھکر تھی۔ ریلوے روڈ نے آمد و رفت میں بہت کچھ سہولتیں بہم پہونچادی تھیں لیکن کچھ دن سے محکمہ تعمیرات کی بے توجہی کے باعث، اس سڑک میں جابجا گڑھے پڑ گئے تھے، اور یہہ "صراط مستقیم" "بحر ظلمات" جانے والی سڑک بن کر رہ گئی تھی۔ بات یہہ ہوئی کہ صوبہ کے صاحب گورنر بہادر نے اپنے کرم سے ضلع کو شرف ورود بخشا تھا ڈسٹرکٹ بورڈ نے گورنر بہادر کے استقبال میں، اپنی نیازمندانہ عقیدت کا وہ بے پناہ جوش دکھایا کہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا فنڈ بالکل دیوالیہ ہو گیا۔ دو چار ممبروں نے ان اندھا دھند اخراجات کے خلاف احتجاج [illegible]

کیا، مگر جس دُنیا میں جاہ و دولت کی پُوجا ہوتی ہو، وہاں کسی خاک نشین کی معقول سے معقول بات پر کان دھرنے کی فرصت کس کو ہے؟ گورنر صاحب تو پھولوں کے ہار پہن کر اور لنچ اور ڈنر کھا کر چلے گئے مگر ضلع کے باشندوں کو ڈسٹرکٹ بورڈ کے "جوشِ عقیدت" کے ہاتھوں جو تکلیفیں اُٹھانا پڑی ہیں، اُس کا سرسری اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ ایکسال کے عرصہ میں، ضلع کی سڑکوں پر چلنے والی گاڑیوں کے بہت سے بیلوں کے کندھے بیکار ہو گئے۔ پختہ سڑک کے گڑھے کا ہچکولا، خدا کی پناہ! دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں۔

سرمایہ داری، افلاس کی مُصیبت سے ہمیشہ فائدہ اُٹھاتی ہے، قیصر پُور جانے والی سڑک کی شکست و ریخت نے یکے اور تانگے والوں کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ بڑے بڑے مضبوط گھوڑے جھٹکے کھا کر بیکار ہو گئے، ضلع کے ایک سرمایہ دار نے، یہہ حالت دیکھ کر، ضلع کی سڑکوں پر موٹر بسیں دوڑا دیں، سڑکوں کے گڑھوں کے بھرنے کے لئے، موٹر لاری کے مالک نے جا بجا مزدور مقرر کر دئے تھے جو درختوں کی ڈالیوں، پتوں، گھانس اور مٹی سے ان خندقوں کو پاٹتے رہتے تھے۔ موٹر لاریوں پر ہی کیا منحصر ہے، تہذیب حاضر کی ہر چیز کو دنیا میں قبولیت حاصل ہوتی ہے، اب یہہ دوسری بات ہے کہ موٹر لاریوں نے ایک شخص کا تو گھر بھر دیا۔ اور سینکڑوں غریبوں کے گھر تباہ کر دئے، اور یکے اور تانگے والوں کا لگا ہوا روزگار خاک میں مل گیا۔ پورے ضلع میں مشکل سے چالیس، پچاس یکے اور تانگے باقی رہ گئے تھے، جن کے مالک، موٹر لاریوں کی بچی کھچی سواریوں کے کرایہ سے پیٹ پالتے تھے، ایک موٹر لاری، قیصر پور ریلوے اسٹیشن سے قصبہ قیصر پور تک جاتی تھی۔ لاری کے ملازمین نے اپنا مستقر اسی قصبہ کو بنایا تھا۔

قیصر پور میں ایک مہاجن رہتا تھا، جو نہ صرف اس قصبہ کا، بلکہ شاید ضلع کا سب سے زیادہ مالدار شخص تھا، اس مہاجن کا سود کا کاروبار دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا، اسی سود

کی بدولت اس نے بہت سے گاؤں خرید لئے تھے کنجوسی میں تو وہ شاید قارون سے بھی دو ہاتھ آگے تھا، کڑاکے کے جاڑے معمولی رضائی میں، انگیٹھی پر تاپ کر گزار دیتا۔ روپیوں سے تجوریاں بھری ہوئی تھیں، مگر ایک ایک کوڑی کو دانت سے پکڑتا، اس کنجوسی اور جُز رسی کے ساتھ ساتھ، حکومت سے خطاب حاصل کرنے کی اُس کو ہوس نہیں، جنون تھا کلکٹر صاحب کے بنگلہ کو جانے والی سڑک کا ذرہ ذرہ، اُس سے واقف تھا، اُس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا، بلکہ شاید آخری تمنا یہی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح "رائے بہادر" ہو جائے۔ وہ کئی سال سے خطاب حاصل کرنیکی کوشش کر رہا تھا، ایک دو مرتبہ صاحب ضلع نے اُس کی سفارش بھی کر دی تھی، لیکن اوپر والے لوگوں نے کوئی توجہ نہ کی۔ اور وہ اس لئے کہ نہ تو پبلک میں اُس کو کوئی قبولیت حاصل تھی، اور نہ اُس نے حکومت کی کوئی قابل قدر خدمت انجام دی تھی، صرف کلکٹر صاحب کی ڈالیوں سے "رائے بہادر" کا خطاب تھوڑی ملتا ہے۔ کوئی فوجی افسر ضلع میں کلکٹر ہو کر آگیا تھا، اُس سے اس کنجوس مہاجن کے تعلقات خوشگوار ہو گئے، کلکٹر نے اس کو مشورہ دیا کہ خطاب حاصل کرنے کیلئے پبلک کی نگاہوں میں بھی تھوڑا بہت مقبول ہونا چاہیئے اور اس کے لئے کسی نمایاں کام کی ضرورت ہے، جاڑوں کے زمانہ میں گورنر بہادر ضلع میں آنیوالے ہیں، تم ایک بڑی رقم اپنے قصبہ میں اسکول قایم کرنے کے لئے دیدو۔ خطاب کی تمنا نے اُس مہاجن کو اندھا بنا دیا تھا، گورنر کے آنے پر اُس نے بہت بڑی رقم، اسکول کے قیام کے لئے دیدی، اور قصبہ قیصر پور میں مڈل اسکول قایم ہو گیا، اور چند ہی سال میں اس کو ہائی اسکول بنا دیا گیا۔ ہمارے ہندوستان کے سیکڑوں اسکول، دواخانے، اور پبلک ادارے، صرف نام و نمود، اور حکومت میں رسوخ حاصل کرنیکی نیت سے قائم کئے گئے ہیں، ورنہ خود غرض سرمایہ داروں کو کسی دوسرے کی بھلائی کے لئے، کچھ سوچنے کی فرصت کہاں ہے؟ وہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کو خدا نے قند و گلاب کا شربت پینے اور

خس کی ٹٹیوں میں رہنے کے لئے ہی پیدا کیا ہے، اُن کو دولت عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کیلئے ہی دی گئی ہے، اب سامانِ عشرت اور اسباب عیش کی فراہمی کے سلسلہ میں، کسی کو خود بخود فائدہ پہنچ جائے، تو یہہ دوسری بات ہے، ورنہ قدرت کی اس چہیتی اولاد کو مزدور کے ماتھے سے ٹپکتے ہوئے پسینے، اور دہقان کے "خون گرم" سے ہمدردی ہو ہی نہیں سکتی۔

اسی مہاجن کے قائم کئے ہوئے اسکول میں توفیق، اور شمشاد تعلیم پاتے تھے، توفیق اور شمشاد ایک ہی محلہ کے رہنے والے تھے، بچپن سے ان دونوں کا ساتھ رہا تھا، اسکول میں ایک ہی جماعت میں داخل ہوئے، اور چھ سال تک مسلسل ساتھ ساتھ پڑھتے رہے یہ دونوں دوستی اور محبت کے فلسفیانہ مفہوم سے بالکل ناواقف تھے، لیکن اگر دوستی، طبیعتوں کی ہم رنگی، مزاجوں کے اتحاد، خیالات کی یک جہتی اور ایک دوسرے کی ہمدردی کا نام ہے، تو شمشاد اور توفیق بڑے گہرے دوست تھے، وہ ایک دوسرے کی رائے سے بہت کم اختلاف کرتے تھے، جہاں ایک نے کوئی بات کہی دوسرے نے اُسے فوراً منظور کر لیا۔ ان کی دُنیا دلائل و تفکر کی اُلجھنوں سے بالکل پاک تھی، یعنی، خوشی، اعتماد اور ہمدردی اُن کی زندگیوں میں گھُل مل گئی تھی، وہ ایک دوسرے سے بہت ہی کم خفا ہوتے تھے، اُن کی دوستی بہت زیادہ گہری نہیں تو اتنی اُتھلی بھی نہ تھی، کہ خفگی اور بدمزگی کے خس و خاشاک کی اس میں سمائی نہ ہو سکے توفیق اور شمشاد میں مشکل سے ڈیڑھ دو سال کی چھوٹائی بڑائی تھی، شمشاد، توفیق سے عمر میں چھوٹا تھا، لیکن توفیق سے قد میں بہت زیادہ لانبا اور موٹا تازہ تھا۔ تنومند، نوجوان ذرا طبیعت کا بھی تیز ہوتا ہے شمشاد کے مزاج میں بھی تیزی تھی، لیکن "تیزی" کا لفظ سُن کر اگر آپ نے شمشاد کو درشت مزاج، چڑچڑا تصور کر لیا، تو آپ نے اُس غریب پر درحقیقت ظلم کیا۔ تیزی اور جوش نوجوانی اور صحت کے لازمات سے ہیں، خون کی گرمی اور اعصاب کی توانائی سے فطرت طبیعت کو

بہ ہر حال متاثر ہونا چاہیئے۔ دیکھتے نہیں ہو کہ پانی کا جتنا دباؤ زیادہ ہوتا ہے۔ اتنا ہی فوارہ کا پانی زیادہ اونچا اچھلتا ہے، شمشاد، فطری اور طبعی طور پر تیز و طرار تھا لیکن ہنس مکھ، خوش طبع اور بہت جلد گھل مل جانے والا! وہ ہر شخص سے خلوص و محبت کیساتھ ملتا، لیکن جہاں کہیں اسے یہہ محسوس ہوتا، کہ اس کی خودداری کو ٹھیس لگ رہی ہے، تو وہ اپنے قابو میں نہ رہتا۔ خودداری اس کی نازک ترین رگ تھی، جس کو کوئی ہلکے سے بھی چھو دیتا، تو اُس کا نظامِ زندگی تہ و بالا ہو جاتا،

قیصر پور کی سڑک کے سلسلہ میں موٹر لاری کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، اس موٹر لاری کے ملازمین، شہر کے رہنے والے تھے، تنخواہ کے علاوہ اوپر سے بھی آمدنی ہو جاتی تھی، یہہ لوگ خوب مزے کی زندگی بسر کرتے تھے، توفیق اور شمشاد کے محلہ ہی میں یہہ لوگ رہتے تھے، اور چونکہ اُجلے پوش اور چرب زبان تھے، اس لئے اسکول کے لڑکوں کے لئے اُن کی صحبت بہت زیادہ دلچسپ تھی۔ توفیق اور شمشاد ان لوگوں کے پاس اکثر آکر بیٹھتے تھے، ان لوگوں کے نئے نئے تراش کے کپڑے، سگریٹ کیس، بجلی کی لالٹینیں، حجامت بنانے کا سامان، پوڈر، کریم، مفلر، نکٹائی سینٹ، دانت مانجھنے کے بُرش، البم، گراموفون، غرض تمام چیزیں نوجوانوں کے لئے بہت زیادہ دلچسپی اور ترغیب و تحریص کا باعث تھیں، موٹر لاری کے ملازمین کے یہاں، نوجوانوں کا جمگھٹا رہتا۔ اور یہ صحبت آہستہ آہستہ رنگین ہونے لگی۔ گراموفون کے ریکارڈوں کی نوجوان نقل کرتے، کوئی تالی بجاتا، کوئی دو کتابوں کو زانو پر رکھ کر، طبلہ کا کام لیتا اور کوئی اپنی آواز میں خوش گلو ایکٹرسوں کی آواز کا لوچ پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔ موٹر لاری کا ڈرائیور اور ٹکٹ چیکر، دونوں شعر کہتے تھے، ان کی دیکھا دیکھی، کئی نوجوان بھی شاعر بن گئے، قفسِ شاعری کے نوگرفتاروں سے ٹکٹ چیکر اور ڈرائیور نے کہا، کہ کسی سے دل لگائے بغیر، شاعری نہیں ہوتی دل میں درد نہ ہو، تو شعر کیا خاک مزا دے گا۔ نوجوانی کی اُمنگیں، اور شاعری کا شوق،

تو پھر عاشق بننے میں کیا دیر تھی، نتیجہ یہہ ہوا کہ بہت سے نوجوانوں نے قصبہ کی لڑکیوں پر عاشق ہونا شروع کر دیا۔ اور بہت سے اچھے، خاصے بھلے مانس "نوجوان" شاعر اور عاشق بن کر رہ گئے۔

موٹر لاری کے ملازمین کے پاس، توفیق اور شمشاد کا اُٹھنا بیٹھنا بہت زیادہ تھا۔ یہہ ملازمین بھی بڑے حرفوں کے بنے ہوئے تھے، نوجوانوں کو اپنی عشق، عاشقی اور ہوس کاری کے کچھ تو گذرے ہوئے۔ کچھ سُنے سنائے اور کچھ گھڑے ہوئے واقعات سُناتے رہتے، ان مبلغین گناہ نے، معصوم نوجوانوں کے دلوں میں یہہ بات اُتار دی تھی کہ قصبات اور دیہات کی زندگی چوپایوں کی زندگی سے بدتر ہے، دہلی، بمبئی اور کلکتہ جیسے شہر، انسانوں کے رہنے کے قابل ہیں، جہاں کیف و سرمستی کی بارش ہوتی ہے، اور قدم قدم پر رنگین مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ یہہ لوگ بڑے بڑے شہروں کے واقعات، اس انداز سے سُناتے، کہ نوجوانوں کے بدن میں سنسنی پیدا ہو کر رہجاتی۔ کتنی دلچسپ اور گمراہ کُن ہوتی تھیں ان لوگوں کی باتیں۔

ایک نوجوان کو اُس کے باپ نے کسی بات پر خفا ہو کر گھر سے نکال دیا، وہ لڑکا سیدھا کلکتہ پھونچا۔ کئی دن تک بیچارہ ادہر، اُدہر مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر بڑی دوڑ دھوپ کے بعد، ایک پارسی کے یہاں اُسے نوکری مل گئی، پارسی کے گھر کا سودا سلف لانا اُس کے ذمہ تھا، پارسی کی لڑکی بالکل نوجوان تھی، صورت دیکھو تو چاند کا ٹکڑا، اس لڑکی سے نوجوان کی آنکھ لڑ گئی، ایک آدھ مہینہ تو دونوں چھپ چھپ کر ملتے رہے، ایک دن موقعہ پا کر، لڑکی نے لاکھوں روپیہ کا قیمتی زیور لیا، اور نوجوان کے ساتھ بھاگ گئی۔ اب وہ نوجوان اور پارسی کی لڑکی کو آمبو

میں مزے اُڑا رہے ہیں۔

اجی! یہہ تو ایک واقعہ بیان کیا ہے، ایسے سیکڑوں واقعے ہمیں یاد ہیں۔ پارسیوں، گجراتیوں اور مارواڑیوں کے یہاں بس۔ ذرا نوکر ہونے کی دیر ہے، پھر تو چاندی ہی چاندی ہے۔ شہر کی عورتیں تو، گاؤں اور قصبہ والوں پر جان دیتی ہیں، پھر کہیں ہمارے توفیق اور شمشاد جیسے نوجوان پہنچ جائیں، تو نوجوان لڑکیاں ٹوٹ ہی تو پڑیں۔

گاؤں اور قصبوں کی بھی کوئی زندگی ہے، لاحول ولا قوۃ! دن بھر خاک پھانکو، اور رات بھر کُتوں کے بھونکنے کی آوازیں سُنو، یہاں تو آدمی کی قسمت پھُوٹ جاتی ہے۔ ترقی کا کوئی میدان ہی نہیں ہے۔

یورپ کا رہنے والا، ایک فقیر بھیک مانگتا، مانگتا بمبئی پھونچ گیا ایک دن وہ سمندر کے کنارے ملھاریں گاتا ہوا جارہا تھا، اُسے ریت پر ایک چمکتی ہوئی چیز نظر آئی، فقیر نے اُس چیز کو اُٹھالیا، اور اُس کو پتھر سے توڑا تو کبوتر کے انڈے کی برابر موتی، سیپی سے نکلا، وہ اُس موتی کو لیکر، جوہری بازار پہونچا۔ اور وہاں کھڑے کھڑے تیس ہزار میں موتی بک گیا۔

اور، ہاں! اس یُورپین فقیر ہی پر کیا منحصر ہے، اُس جیسے ہزاروں فقیر، دولتمند بن گئے، لوگ خالی ہاتھ پہونچے، اور اشرفیاں جیبوں میں بھر کر لائے۔

کلکتہ اور دہلی میں تو دھن برستا ہے، انگلستان کے شاہزادہ کی ایک سیٹھ نے دعوت کی تو خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی چالیس ہزار روپیہ کے نوٹ جلاکر، شاہزادہ کے لئے چائے تیار کرائی۔

قصبہ کے نوجوانوں کے لئے، شہر کی رنگین معاشرت اور سُنہری مواقع کی داستانیں بڑی ہی ترغیب اور تحریص کا باعث تھیں۔ موٹر لاری کے ملازمین کی اِس ہم جنسی اور صحبت کا

یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے لڑکے عملی طور پر نہیں تو کم از کم خیالی طور پر آوارہ ہو گئے۔

پردیس میں

توفیق اور شمشاد، نویں کلاس میں پڑھتے تھے، سالانہ امتحان سے تین مہینہ پہلے شمشاد میعادی بخار میں مبتلا ہو گیا، بخار نے بہت طول کھینچا، اور وہ سالانہ امتحان میں شرکت کے قابل نہ ہو سکا۔ توفیق نے محنت تو بہت کچھ کی تھی، مگر ہماری تعلیم کے نصاب کو دیکھ کر، کسی ذہین سے ذہین اور محنتی سے محنتی طالب علم کے متعلق بھی کامیابی کی پیشین گوئی نہیں کیجا سکتی۔ توفیق غیر معمولی ذہین نہیں تو اتنا کُند ذہن بھی نہ تھا، کہ نویں کلاس کے نصاب کو محنت و کوشش کے باوجود پُورا نہ کر سکے لیکن سالانہ امتحان کے ختم ہونیکے بعد جب نتیجہ سنایا گیا ہے، تو کامیاب لڑکوں کی فہرست میں، توفیق کا نام نہ تھا۔ بات یہہ ہوئی کہ تاریخ کے پرچہ میں، توفیق کو خاطر خواہ نمبر نہ مل سکے۔ اُس نے تاریخ کے پرچہ کے سوالات کا جواب، تاریخ کی اُس کتاب کے خلاف دیا، جو نویں کلاس میں پڑھائی جاتی تھی۔ توفیق نے اپنی رائے کے ثبوت میں بہت سے تاریخی حوالے بھی پیش کئے، اور تصریح کے ساتھ بتایا کہ جو کتاب نویں کلاس کے کورس میں شامل ہے، اُس میں بہت سے واقعات تاریخی نقطۂ نگاہ سے غلط ہیں، لیکن جس دُنیا میں، طالب علم کے دل و دماغ کو چند مخصوص کتابوں اور نظریوں کا پابند کر دیا جاتا ہو، وہاں عجز توفیق کی کون سُنتا تھا ۔ بہ ہر حال توفیق کی قسمت میں ناکام ہونا لکھا تھا، اور قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہا۔

توفیق کی ناکامی نے تمام گھر والوں کو متاثر کیا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے

کسی جوان موت کا اس گھر میں سوگ منایا جا رہا ہے، توفیق کو سب لوگ خفگی اور ذلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بات بات میں غریب پر ڈانٹ پڑتی تھی۔ گھر والوں کے تیور دیکھ کر، توفیق کو بڑا دُکھ ہوا، اور وہ اپنے عزیز و اقارب کی صحبت سے کترانے لگا۔ توفیق کے گھر والوں کی ناراضی کسی طرح کم نہ ہوتی تھی، ایک دفعہ تو کسی بات پر توفیق کے باپ کے منہ سے نکل ہی گیا۔

"توفیق! کاش! تو پیدا نہ ہوا ہوتا اور میری"
"مجھے بڑھاپے میں یہہ غم نہ اُٹھانا پڑتا"

اول تو گھر کی موجودہ زندگی سے توفیق بددل ہو گیا تھا، دوسرے موٹر لاری کے ملازمین نے اس کے دل میں یہہ بات اُتار دی تھی کہ کلکتہ، بمبئی جیسے شہروں میں بس پہونچنے کی دیر ہے، لکشمی دیوی خود ہی چرنوں پر ماتھا ٹیک دیتی ہے۔ توفیق کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ اُس کے بچپن کے دوست شمشاد کی جُدائی تھی، وہ کئی دن تک ایسی پس و پیش میں رہا اور شمشاد کی محبت اُس کے دامنِ عزم کو تھامے رہی، شمشاد کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے باہر جانا پڑا، اور توفیق نے ایکدن موقعہ پا کر گھر سے کچھ روپیے لئے، اور سیدھا کلکتہ پہونچا۔

توفیق کا پورا بچپن اور جوانی کے چند سال، قیصر پور ہی میں بسر ہوئے تھے کلکتہ کے ٹھاٹ باٹ کو دیکھ کر، اُس کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ گئے۔ آئینہ خانہ میں جیسے کتا بوکھلا جاتا ہے، بالکل اِسی طرح توفیق کلکتہ کی سڑکوں پر پھرتا تھا۔ موٹروں کی کثرت، عالیشان مکان، چوڑی اور صاف سڑکوں پر لوگوں کی گہما گہمی، غرض ایک ایک چیز توفیق کے لئے عجیب اور جاذب توجہ تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا، گویا کہ اُسے

قبرستان سے اٹھا کر، کسی فیکٹری میں پہنچا دیا گیا ہے۔ ما شاء اللہ بعا عمل ے

توفیق کئی دن تک اِدھر اُدھر بیکار پھرتا رہا۔ جب گھومتے گھومتے طبیعت بھر گئی، تو نوکری کے لئے دوڑ دھوپ شروع کی۔ کلکتہ جیسے شہر میں، جہاں بی، اے ایم۔ اے، روزگار کی تلاش میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں، ایک نویں کلاس تک پڑھے ہوئے چھوکرے کو کون پوچھتا تھا۔ توفیق نے بیسیوں کارخانوں اور دفتروں میں، درخواستیں بھیجیں، مگر ہر جگہ سے انکاری جواب ملا، توفیق جو کچھ روپیہ پیسہ گھر سے لایا تھا، وہ قریب قریب ختم ہو گیا، اب اس کے لئے بڑی دشواری کا سامنا تھا۔ پردیس، بے روزگاری، ناکامیاں، یہ تمام چیزیں مل جُل کر، اُس کے لئے وبالِ جان بن گئی تھیں۔ توفیق نے اگرچہ عیش و عشرت اور ناز و نعم میں پرورش نہیں پائی تھی، اُس کے باپ کا قصبہ کے غریب لوگوں میں شمار ہوتا تھا، لیکن اُس کو بہرحال دونوں وقت پکی پکائی روٹی، اور پہننے کے لئے کپڑے بےفکری کے ساتھ مل جاتے تھے، کلکتہ میں آکر اُس کو قدر ہوئی کہ پیٹ بھرنے اور تن ڈھانکنے کے لئے آدمی کو کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

خدا کی مدد، اور غیبی تائید، اس عالمِ اسباب میں، اسباب کے ہی ذریعہ ہوتی ہے۔ جب خدا کسی بھوکے کی امداد فرماتا ہے، تو کسی انسان کے دل میں بھوکے کیلئے رحم کا جذبہ پیدا کرتا ہے، اور وہ آدمی بھوکے کو کھانا کھلا دیتا ہے، آسمان سے کبھی انسان کے لئے حلوے کے طباق، فیرینی کے پیالے اور آچار کے مرتبان نازل نہیں ہوئے، اور نہ کسی غریب اور مفلس کے گھر کے انگن میں اشرفیوں، اور روپیوں کی بارش ہوئی، توفیق کو بھی خدا کی تائید، ایک بنگالی نوجوان کے بھیس میں حاصل ہوئی، یہ بنگالی نوجوان

ایک کارخانہ میں کلرک تھا توفیق سے اس کی صاحب سلامت ہوگئی، آدمی تھا ملنسار اور خلیق، توفیق اس کے پاس آنے جانے لگا، اور جب اس نوجوان کو یہ معلوم ہوا کہ توفیق بیروزگاری کے ہاتھوں تباہ اور پریشان ہے، تو اس نے اپنے ایک دوست سے کہہ سن کر، توفیق کو ایک پارسی کے یہاں نوکر رکھا دیا۔

پارسی کے یہاں کوئلہ کی ایجنسی تھی، کاروبار تو زیادہ بڑا نہ تھا، پھر بھی اس کی اتنی آمدنی تھی کہ اس کے یہاں ایک چھوڑ، دو دو تین تین موٹر تھے۔ توفیق کے ذمہ، مزدوروں کی نگرانی اور ان کی حاضری کے رجسٹر کی خانہ پری تھی، توفیق نے ہوٹل کی رہائش ترک کر دی تھی، اور وہ اپنے بنگالی دوست کے یہاں اٹھ آیا تھا۔ توفیق کے یہاں چلے آنے میں دونوں کو کفایت ہوئی، توفیق تو ہوٹل کے بھاری کرایہ سے بچ گیا، اور بنگالی نوجوان پر اب کمرہ کے کرایہ کا آدھا بار رہ گیا۔ دونوں دوست ہنسی خوشی کیساتھ رہنے لگے۔

جس پارسی کے یہاں توفیق ملازم تھا، اس کی لڑکی کا نام زمرد تھا۔ زمرد بیس برس کے لگ بھگ تھی، پارسی عورتیں عام طور پر گوری چٹی اور کشیدہ قامت ہوتی ہیں، زمرد میں ان دونوں خصوصیتوں کے علاوہ، تناسب جسمانی اور ناک نقشہ کی موزونیت بھی پائی جاتی تھی، توفیق نے جب اس کو پہلی دفعہ دیکھا ہے، تو اس کے حافظہ نے، ان تمام واقعات کو اسکی نگاہوں کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا، جو اس کے وطن قیصر پور میں، موٹر لاری کے ملازمین گاؤں کے لوگوں کو سنایا کرتے تھے، توفیق کو یقین ہو گیا تھا، کہ اس کا ستارہ، گردش سے نکل گیا، اور پارسی کی لڑکی دو چار دن میں اس پر عاشق ہو ہی جائے گی۔ توفیق ایک ایسا خواب دیکھ رہا تھا، جس کی تعبیر وہ خواب دیکھنے سے بہت پہلے خود ہی متعین کر چکا تھا۔ اس نے اپنے بنگالی دوست سے بھی اپنے دل کی بات چھپائی، اور وہ اس لئے کہ توفیق اس روشن مستقبل اور حسین کامیابی میں اپنے بنگالی دوست کو کسی طرح

اپنا شریک اور ہمراز بنانا نہیں چاہتا تھا۔ توفیق نے جو پلاٹ تیار کیا تھا اُس کے لحاظ سے یہہ چھپانے
کی بات بھی تھی، ایسی کامیاب اور حسین اسکیمیں، کہیں یار دوستوں کو بتائی جاتی ہیں۔

پارسی کی لڑکی زمرد جب دفتر میں آتی تو توفیق اُس سے بات چیت کرنے کے لئے کوئی
نہ کوئی موضوع تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔ زمرد کو اس کا بھولے سے گمان بھی نہ ہوسکتا تھا، کہ
اُس کے یہاں کا ایک معمولی ملازم، جس کے بدن کا لباس بھی درست نہ تھا، اُس سے عاشقی
کرسکتا ہے، زمرد کو توفیق سے بات چیت کرنے کی کوئی ضرورت ہی پیش نہ آتی تھی، لیکن توفیق
ہمیشہ کسی نہ کسی عنوان سے، بات چیت کرہی لیتا۔ یہہ عنوانات، اگرچہ بے تکے ہوتے تھے،
~~مگر اُن کا تذکرہ نہ کیا جائے گا، تو افسانہ نگار، کتاب پڑھنے والوں پر بڑا ظلم کریگا۔~~

—— مس صاحبہ! دیکھئے چبوترے کی سیڑھی پر آہستہ سے پیر رکھئے —— توفیق نے کہا

—— آخر کیوں! یہہ تم آج کیا نئی بات کہہ رہے ہو —— پارسی کی لڑکی زمرد نے جواب دیا

—— کل شام ایک دلّال، سیٹھ صاحب سے ملنے کے لئے آیا تھا، اس سیڑھی
پر پیر رکھتے ہی گر پڑا۔ معمار کی غلطی سے پھسلنے والے پتھر اس چبوترے
میں لگا دئے گئے ہیں —— توفیق، زمرد کو خوب غور
سے دیکھتے ہوئے بولا۔

—— مس صاحبہ! کل شام ہمارے محلہ میں آگ لگ گئی بیچارے، چینی سوداگر
کا ہزاروں کا نقصان ہوگیا —— توفیق نے غم انگیز لہجہ میں
کہا ——

—— میں نے تو آج کا اخبار بہت غور سے پڑھا ہے، اس میں یہہ خبر درج
نہیں ہے —— زمرد نے جواب دیا

——— اجی! ان اخبار والوں کو خدا غارت کرے، معمولی معمولی خبروں کو چھاپ دیتے ہیں، اور بڑی بڑی خبروں کا ذکر تک نہیں کرتے ——— توفیق قدرے گھبرا کر بولا ———

توفیق کی روز کی گفتگو کے عنوانات کس قدر دلچسپ ہوتے تھے! ———

——— مس صاحبہ! ہمارے محلہ میں ایک صاحب کل ہی انگلستان سے آئے ہیں وہ کہتے تھے کہ فروری نہیں تو مارچ کے شروع میں ضرور جنگ چھڑ جائیگی

——— ناخدا کی مسجد سے کچھ دور پر، ایک نجومی آکر ٹھہرا ہے جو ذرا سی دیر میں تمام اگلے پچھلے حالات بتا دیتا ہے۔

——— آپ کے بچپن کا فوٹو، میں نے ایک فوٹو گرافر کے یہاں دیکھا تھا آپ کے چہرے میں اب تو بڑی تبدیلی ہو گئی ہے، بہت سے دیکھنے والے تعریف کر رہے تھے، کہ اس سے بہتر پوز (   ) ہم نے نہیں دیکھا ———

——— میں تو اتنی جرأت نہیں کر سکتا، آپ کسی طرح سیٹھ صاحب کے کان میں یہ بات ڈال دیجئے، میں نے کل سنا ہے کہ کوئلہ کا بھاؤ، اب گرنے والا ہے، اس لئے کوئلہ ذرا احتیاط کیساتھ اور ہاتھ روک کر خریدیں۔

——— یہ گورکھے بلا کے کام کرنیوالے ہوتے ہیں، ہمارے یہاں بھی کچھ گورکھے ضرور ملازم رہنے چاہئیں۔ کل ایک پوربیے کی گردن میں کوئلہ کا بورا اٹھاتے ہوئے جھٹکا آگیا، دوسرے مزدور بھی کہنے لگے کہ ایک تھیلے میں سوا من سے زاید کوئلہ نہیں ہونا چاہیئے ———

——— مس صاحبہ! آج کل شہر میں چوری اور نقب زنی کے بہت سے واقعات

ہو رہے ہیں، دیکھئے! ہمارے کارخانہ کا پھاٹک کتنا کمزور اور پرانا ہو گیا ہے، اس کے بدلوانے کی ضرورت ہے۔

——— کل مجھے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ ریاست حیدر آباد دکن میں ایک جاگیردار کے یہاں، اُس قالین کا ایک ٹکڑا ہے، جس پر شاہ جمشید بیٹھ کر شراب پیا کرتے تھے۔

——— آپ کو نزکام ہو رہا ہے، آپ فرمائیں تو میں یونانی دواخانہ سے ایک مجرب اور آزمودہ دوا لاکر پیش کر دوں۔

زمرد توفیق کی باتوں کو سُن کر مُسکرا دیتی، زمرد کی یہہ مسکراہٹ، توفیق کی ہمت کو بڑھا دیتی تھی، اور اُسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ لڑکی کے دل میں اُس کی محبت کا نشتر آہستہ آہستہ اُتر رہا ہے، اور بس کوئی دن میں معرکہ سر ہوا چاہتا ہے وہ اب پارسی کے کارخانہ کو اپنا کارخانہ سمجھتا تھا، اور وہ اس لئے کہ زمرد، پارسی کی اکلوتی لڑکی اور تنہا وارث تھی، اور چونکہ اُس نے یہہ فرض کر لیا تھا، کہ زمرد کچھ دن میں اُس کی ہو جائیگی، اس لئے منطقی طور پر نہیں، بلکہ ریاضی کے مسلمہ اصول کے طور پر، تمام جایداد کا وہ بالواسطہ مالک ہو جائیگا۔

زمرد جب کبھی کارخانہ میں آتی، تو توفیق کی نگاہیں، اُس کی ایک ایک ادا کا جائزہ لیتیں۔ زمرد کی نشست و برخاست، چال ڈھال، گفتگو، غرض اُس کی ایک ایک حرکت کو، توفیق گہری نگاہوں سے دیکھتا۔ اور پھر گھر پہنچ کر، تنہائی کے عالم میں، دل ہی دل میں تنقید کرتا۔

——— مجھے ہی دیکھ کر مسکراتی تھی، اور ہاں! میں گیا بھی تو تھا، نیا کوٹ پہن کر، اور بال سنوار کر!

ہاں! اُس نے رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے، میری طرف کچھ یُوں ہی سا اشارہ بھی کیا تھا۔ میں بھی، بڑا اُلّو ہوں، وقت سے فائدہ اُٹھانا نہیں جانتا۔ مجھے اُس کے اشارہ کا جواب دینا چاہیئے تھا۔

——— اچھا، تو وہ جب مجھ پر مرتی ہے تو کھُل کر بات کیوں نہیں کرتی ۔ مگر ہاں! وہ بیچاری بھی تو مجبور ہے، اُس کا باپ کتنا سخت واقع ہوا ہے

——— محبت میں جُدائی اور شرم وحیا کی اُلجھنیں اور کشمکش نہ ہو، تو محبت میں لُطف ہی نہیں آسکتا۔ محبت تو تڑپنے اور تڑپانے ہی کا نام ہے، مگر اب یہہ منزل بھی بہت قریب آچکی ہے ۔

——— آج اُس نے میرے سوال کا جواب دیتے وقت مجھے بڑے غور سے دیکھا تھا، جیسے کوئی کسی سے اپنے دل کی بات کہنا چاہے، اور کسی مجبوری کے سبب نہ کہہ سکے، اور اُس نے آج اپنے بالوں میں دیوار کے سہارے کھڑے ہوکر، جو بہت سی گہریں لگائی تھیں، اُس کا آخر مقصد کیا تھا ——— یہی کہ وہ مجھے لُبھانا چاہتی تھی ——— میرا رنگ تو خیر اُس کے رنگ سے پھیکا ہے، مگر ناک، نقشہ تو بُرا نہیں ہے، اور پھر مجھ میں مردانہ حُسن بھی تو پایا جاتا ہے، اُس کو ضرور مجھ سے تعلقِ خاطر ہوگیا ہے ۔

——— سچ کہا ہے کسی نے کہ آدمی کی قدر، وطن سے باہر ہوتی ہے، ——— بس اب کچھ دن کی دیر ہے، پھر تو چاندی ہی چاندی ہے ——— لیکن ہاں ایک بڑی خرابی ہے کہ وہ پارسی ہے، اور میں مُسلمان ۔! پھر شادی کس طرح ہوگی، مگر ——— ہاں ۔! جب وہ مجھے ہی اپنا سب کچھ سمجھیگی،

تو پھر اُس کو مسلمان ہونے میں کونسا امر مانع ہوگا۔ اور اگر کچھ دن تک
یوں ہی محبت جاری رہی، تو اس میں ایسا کونسا ہرج ہے۔ محبت میں تو
کفر و اسلام کی تمیز اُٹھ جاتی ہے، اور ہمارے شاعروں نے تو معشوق کو
ہمیشہ "کافر" ہی کہا ہے۔

اس قسم کی باتوں سے توفیق اپنے دل کو تسکین دیتا تھا، شاعر نے کچھ دیکھ کر ہی کہا ہے

برق کی سی چشمک تھی، وہ نگاہِ بے پروا
اس پہ آرزو کیا کیا، حاشیے چڑھاتی ہے

توفیق بھی نہ صرف حاشیے چڑھا رہا تھا، بلکہ تمناؤں اور اُمیدوں کے حسین قلعے
تیار کر رہا تھا، ایسے قلعے جن کے کنگرے عرش سے اونچے نکل گئے تھے، اور جن کا ماحول
حُسن و دولت کے خیالی مسالے سے تیار ہوا تھا۔ توفیق نے بہت دن تک گفتگو اور نظارہ پر
اکتفا کیا۔ مگر اب اُس کے دل کی بے چینی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتی تھی، وہ صرف موقعہ
کی تلاش میں تھا۔ ایکدن پارسی اتفاق سے بیمار ہوگیا، اور اُس کا مینجر کوئلہ کے سوداگروں کی
کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے استنبول چلا گیا۔ ریلوے اسٹیشن پر پارسی کے گودام کے لئے
کوئلہ کے بہت سے ڈبے آئے ہوئے تھے، ریلوے کے ملازمین کی کسی غلطی کے باعث ڈبوں
پر بہت زیادہ "ڈیمرج" لگا دیا گیا۔ اس سلسلہ میں ریلوے مال گودام کے سپرنٹنڈنٹ
سے ملنے کی ضرورت تھی، پارسی نے زمرد سے کہا، کہ تم جا کر اسٹیشن کے ذمہ دار افسروں سے
بات چیت کر آؤ، اگر منیجر کے آنے کا انتظار کیا گیا تو اور زیادہ "ڈیمرج" دینا پڑیگا۔ پارسی
نے ضروری کاغذات توفیق کو دیدی، اور زمرد اور توفیق، موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔
توفیق کی مسرت کا عالم نہ پوچھئیے، اُس کا دل بلیوں اُچھل رہا تھا، اُسے یقین

تھا کہ آج تمام معاملات طے پا جائیں گے' اور قدرت نے اُس کو یہ ایسا سنہری موقعہ دیا ہے' موٹر روانہ ہوئی' اور توفیق نے للچائی ہوئی نظروں سے زمرد کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ زمرد توفیق کی نگاہ بازی سے بالکل غافل تھی' وہ اطمینان کیساتھ' بازار کی طرف دیکھ رہی تھی ۔توفیق نے جب دیکھا کہ لڑکی' اُس کی طرف توجہ ہی نہیں کرتی تو اُس نے خود ہی اقدام کیا۔

——— مس صاحبہ! آپ آج بہت خاموش ہیں' اب تو بولنے کی ضرورت ہے" ——— توفیق نے حسرت کیساتھ کہا ———

——— اب بولنے کی ضرورت ہے' اس سے تمہارا مطلب کیا ہے ——— زمرد نے قدرے خفگی کیساتھ جواب دیا ———

——— بھئی ——— آپ' بہت زیادہ شرم اور احتیاط سے ——— کام لیتی ہیں' اب تو بہت دن ہو گئے ہیں ——— توفیق موٹر کا دروازہ چھوتے ہوئے بولا ۔

——— ایں ۔! یہہ تم کو آج کیا ہو گیا ہے' بالکل شرابیوں جیسی باتیں کرتے ہو' بات کا سر نہ پیر کیا تم کو موٹر میں بیٹھ کر دورہ پڑتا ہے ——— زمرد نے ساڑی کا پلّو سر پر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

——— دورہ تو نہیں پڑتا۔ مگر ہاں! محبت تو خود مستقل دورہ ہے'

زمرد! نادان نہ بنو، میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرو، اور یہاں کوئی غیر تھوڑی ہے، اور وہ (موٹر ڈرایور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تو موٹر چلانے میں ہمہ تن مصروف ہے۔ زمرد! بالکل بے تکلف ہو جاؤ ـــــ توفیق نے زمرد کی طرف سرکتے ہوئے بولا ـــــ

ـــــ توفیق ـــ! خاموش ہو جاؤ، ایسی باتیں نہیں کیا کرتے، تم آج بالکل اپنے حواس میں نہیں ہو، تمہارے چہرے پر عجب قسم کی وحشت برس رہی ہے۔ اور ـــــ

زمرد اپنی بات کو پوری طور پر کہنے بھی نہ پائی تھی، کہ اتنے میں مال گودام آگیا۔ موٹر رکی، ڈرایور نے موٹر کا دروازہ کھولا، اور دونوں موٹر سے اتر گئے۔

زمرد توفیق کی طرف سے کچھ کھٹک گئی تھی وہ اُس سے بچ بچ کر چلنے لگی، توفیق یہی سمجھ رہا تھا کہ دوشیزگی کی شرم حایل ہے۔ یہہ ذرا جاتی رہی تو پھر میدان فتح ہے۔ زمرد ایک تو ویسے ہی خوبصورت تھی، اور اُس کی گھبراہٹ اور خفگی نے، اُسے نہ جانے کیا بنا دیا تھا، توفیق کے سینہ میں جوان دل تھا اور دماغ میں مستقبل کی شاندار اسکیم تھی، کنواری لڑکی معیت نے اُس کے احساس کو بہت زیادہ تیز بنا دیا تھا، اُس پر جذبات کا نشہ سا چھا گیا تھا، اُس نے زمرد کے قریب آکر، گھبرا کر کہا ـــــ

ـــــ زمرد! دیکھو بڑا اچھا موقعہ ہے، چلو! یہاں سے سمندر کی طرف چلیں، ایسے موقعے روز روز تھوڑی ملتے ہیں ـــــ

زمرد نے، اس پر توفیق کے منہ پر پوری طاقت کیساتھ جو تھپڑ رسید کیا ہے،

تو وہ چکر کھا کر رہ گیا، زمرد کی زبان سے یہہ فقرہ سُن کر ۔

—— اچھا! پولیس کو اطلاع کرتی ہوں ۔

جو توفیق وہاں سے بھاگا ہے، تو بہت دُور جا کر دم لیا، اور وہاں سے ٹرام میں بیٹھ کر گھر آ گیا ۔ محبت کا نشہ ہرن ہو چکا تھا، اور زمرد کے پھولے ہوئے نتھنوں غشمگیں نگاہوں، اور سلوٹوں سے بھری ہوئی پیشانی کے تصور سے توفیق گھبرا اُٹھتا تھا ۔ توفیق جب کئی دن تک کام پر نہیں گیا، تو اُس کے دوست نے کام پر نہ جانے کا سبب پوچھا، اُس نے دوست کے شدید اصرار پر ایک فرضی واقعہ گھڑ کر سُنا دیا، اُس نے کہا ۔

یہہ پارسی، عجب متعصب شخص ہے، روزانہ مذہبی بحث نکالا کرتا ہے، کچھ دن تک تو میں ٹالتا رہا ــــ لیکن پچھلی جمعرات کو، میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں نوکری کرنے کے لئے آیا ہوں، مذہبی بحث کرنے کے لئے نہیں ۔ اُس نے پھر ایسی ہی طنز آمیز باتیں شروع کیں، مجھے بھی تاؤ آ گیا، اور میں اُس کی طرف تیز ہو کر بڑھا، پارسی کے منیجر نے مجھے پکڑ لیا نہیں تو اُس مردود کا خاتمہ ہی تو کر دیتا ــ

پارسی نے دفتر میں جا کر اندر سے پرچہ لکھ کر بھیج دیا کہ توفیق کو ملازمت سے برطرف کیا جاتا ہے، میں یہہ حکم سُن کر سیدھا مکان چلا آیا ۔ اچھا ہوا، وہاں ہی پھندہ کٹ گیا، نہیں تو خدا معلوم کیا جھگڑے آ کر پڑتے ۔

توفیق کے دوست نے اُس کے مذہبی جوش کی بہت تعریف کی، اور اِس کو بہت تسلی دی کہ گھبراؤ نہیں، کہیں نہ کہیں تمھارا ٹھیک ہو جائے گا، جب تک میں کلکتہ میں موجود ہوں، تم کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی ۔

عبرتناک انجام

توفیق کے بنگالی دوست نے اپنا کہا پورا کر دکھایا۔ ایک مہینہ تک تو توفیق بیکار رہا، اور اس مدت میں، توفیق کے تمام اخراجات اُسی نے برداشت کئے، توفیق کا بنگالی دوست بڑا ملنسار اور خوش اخلاق تھا، بہت سے لوگوں سے اس کا میل جول تھا، اور سب لوگ اُس سے عزت کیساتھ پیش آتے تھے، اسی کی کوشش اور پیروی سے توفیق کو روٹی کے کارخانہ میں جگہ مل گئی۔ اور توفیق پابندی کیساتھ اپنے فرائض انجام دینے لگا۔ کلکتہ میں توفیق کے بہت سے دوست ہو گئے، اور احباب کا یہ حلقہ رفتہ رفتہ ترقی کرنے لگا توفیق کے نئے دوستوں میں مختلف طبایع کے لوگ تھے، جن کی صحبت توفیق کو ایک نئی منزل کی طرف لیجا رہی تھی ــ تھیٹر ہالوں کی سیر اور سینما بینی تو اُس کے احباب کا معمولی مشغلہ تھا، ان میں سے بعض نوجوان تو چھٹے ہوئے بدمعاش اور انتہائی آوارہ تھے۔

توفیق نے قیصر پور کی خشک، اور سادہ فضا میں پرورش پائی تھی، موٹر لاری کے ملازمین کی زبانی سنے سنائے قصوں کے علاوہ، اُسے شہر کی رنگینیوں کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اُس کی زندگی کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اُس کی زندگی کا سب سے زیادہ رنگین واقعہ پارسی کی لڑکی زمرد سے عشق بازی کا تھا، سو اُس عشق بازی کے افسوسناک انجام کے تصور سے، اُس کو پسینہ آتا تھا۔ اب دوستوں کی صحبت میں اُس کی بالکل نئی زندگی شروع ہوئی۔

توفیق، قیصر پور میں شعر موزوں کر لیا کرتا تھا، اُس کی آواز میں لوچ تھا، اس لئے

نہایت پست اور غلط' مسلط اشعار بھی اُس کی زبان سے بھلے معلوم ہوتے تھے' کلکتہ کے دوستوں نے اُس کی اتنی ہمت افزائی کی کہ اُس غریب کا دماغ عرش پر پہونچا دیا' اُن لوگوں نے توفیق کو باور کرا دیا تھا کہ نوجوان شعراء میں اُس کا آج جواب نہیں ہے' اور اُس کے بعض اشعار' تو غالب اور مومن کے شعروں سے ٹکر کھاتے ہیں۔ اُس کے دوستوں نے اُسے شراب پینے کی رغبت دلائی' توفیق شراب کے نام سے کانوں پر ہاتھ دہرتا تھا۔ اور اس گناہ کے لئے وہ کسی قیمت پر تیار نہ تھا' لیکن دوستوں کے اصرار اور اُنکے رنگین دلایل نے اُس کے زہد و معصومیت کو آخر مغلوب کرکے چھوڑا۔ شراب کے متعلق توفیق کے دوستوں نے اُس سے کہا:۔

شراب اور شعر کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے' شراب پیئے بغیر تو شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔ دیکھتے نہیں ہو خیام کی رُباعیوں میں کتنی مستی پائی جاتی ہے' یہہ سب شراب ہی کی کرامات ہے' غالب کو جو آج ہندوستان کے تمام شاعروں پر برتری حاصل ہے' اُس کا سب سے بڑا سبب' اُس کے کلام کی مستی اور تاثیر ہے' اور شراب نوشی کے بغیر کلام میں مستی اور تاثیر پیدا ہو ہی نہیں سکتیں۔

بات یہ ہے کہ شراب پی کر' دماغ پر سرور کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں' اُس ترنگ میں شاعر" جو سوچتا ہے' اسی کا نام تو" الہام" ہے۔ یورپ کے جتنے مضمون نگار اور ادیب ہیں' وہ شراب پی کر ہی مضمون لکھتے ہیں' شراب' دل و دماغ کے خوابیدہ احساس کو بیدار کر دیتی ہے لیکن ہاں! ذرا اعتدال کی ضرورت ہے' صحت کے رکھ رکھاؤ کے لئے شراب سے بہتر کوئی ٹانک (طاقتور) آج تک تیار ہی نہیں ہوا۔

دُنیا کا آدھا لطف تو شراب سے اور صرف شراب سے ہے،
کیسا ہی صدمہ اور رنج کیوں نہ ہو، جہاں ایک پیگ چڑھایا، رنج
وغم کی ساری بساط ہی اُلٹ گئی۔ شراب، مسرت کی خلاق اور عشرت
وآسودگی کی پروردگار ہے۔ غم والم کی دشمن، مسرتوں کی ہمجولی۔! ایک
گھونٹ حلق سے اترا کہ رگ وپے میں توانائی دوڑ گئی۔

مذہب نے ہاں! اس کو ضرور بُرا کہا ہے، مگر اس کی اچھائیوں
کا بھی تو اقرار کیا ہے، پھر مذہب کے تمام احکام سر آنکھوں پر، مگر اس زمانے
میں مذہب کی کس بات پر عمل ہو رہا ہے، تمام دُنیا کسی اور ہی راستہ
پر جا رہی ہے، نئے نئے مسائل دماغوں کے سامنے آ رہے ہیں، آدمی اگر
جھوٹ اور برائی سے اجتناب کرے، کسی کو دُکھ نہ پہنچائے، لوگوں کیساتھ
اخلاق سے پیش آئے، اور ان تمام اچھائیوں کیساتھ تھوڑی سی شراب
بھی پی لے، تو اس میں ایسا کونسا ہرج ہے ——

غرض توفیق کی تمام حجتوں اور دلیلوں کو اُس کے دوستوں نے توڑ کر رکھہ دیا، اور
اُس کو اس بات کا یقین دلا دیا کہ شراب نوشی، تہذیب وتمدن میں داخل ہو چکی ہے، اور
اس سے اجتناب کے یہہ معنیٰ ہیں کہ انکار کرنیوالا گنوار، اُجڈ اور غیر مہذب ہے۔ یورپ کی اتنی
بڑی مہذب آبادی جس چیز کو پانی کی طرح استعمال کرتی ہو، بھلا وہ کہیں بُری اور مضر صحت
ہو سکتی ہے۔ توفیق نے آخر کار شراب پینا شروع ہی کر دیا۔ ابتدا میں تو اُس نے اعتدال
برتا، لیکن شراب کی لذت، اعتدال واحتیاط کی حدود میں کب محصور رہ سکتی ہیں۔ نتیجہ یہہ ہوا
کہ توفیق دھڑلے کیساتھ زیادہ سے زیادہ شراب پینے لگا، اس کی آمدنی اُس کے شوق کو پورا

کرنے کے لئے کافی نہیں ہوسکتی تھی۔ توفیق نے احباب سے قرض لینا شروع کیا۔ اب وہ اپنے بنگالی دوست کے یہاں سے چلا آیا اور نئے دوستوں کے ساتھ رہنے لگا۔

شراب کا سُرور، بہت سی لذتوں کو چاہتا ہے، توفیق کے دوستوں نے ان لذتوں کو حاصل کرنے کے لئے اُس کی ازخود رہنمائی کی، توفیق کو بتایا گیا کہ مُغلیہ بادشاہوں کے زمانہ میں شریف لوگوں کے بچے، طوائفوں کے یہاں تربیت کے لئے بھیجے جایا کرتے تھے، طوائفوں کی صحبت میں تمیز اور سلیقہ آتا ہے، تجربات میں اضافہ ہوتا ہے۔ نئے نئے کردار، اور مختلف قسم کے اطوار و اخلاق کے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے، موسیقی رُوح میں بالیدگی پیدا کرتی ہے، اسی لئے تو بڑے بڑے صوفیوں اور مُرشدوں نے موسیقی کو اپنے سلسلہ میں داخل کیا ہے۔ شراب عیش موسیقی اور شعر، یہی چار چیزیں تو زندگی کو زندگی بناتی ہیں۔

توفیق دوستوں کے ساتھ طوائفوں میں جانے لگا، پہلے پہل تو اُس نے واقعی صرف ذوق سماعت و نظر کی تسکین کے لئے طوائفوں کے بالاخانوں کا طواف کیا لیکن عیش و مسرت کا جذبہ ذوق و نظر کی تسکین تک اگر صرف محدود ہو کر رہ جائے تو ہمارے نوجوانوں کی اصطلاح میں اُس کو نفس کی بزدلی اور "قوت" کی کمی سے تعبیر کیا جائے گا۔ توفیق کی زندگی نہایت ہی خطرناک منزل سے گذر رہی تھی، اور وہ اب ایک ایسی چٹان پر کھڑا ہوا تھا، جس کے ایک طرف دہکتے ہوئے انگارے، اور دوسری طرف اتھاہ سمندر تھا۔ پہلے پہل، اُس کے دل میں گناہ کرتے ہوئے جھجک اور گھبراہٹ تھی، اور تنہائی کے عالم میں وہ ایک قسم کی ندامت بھی محسوس کرتا تھا، لیکن اب وہ نڈر عیاش اور انتہائی بے باک نفس پرست انسان تھا۔ گناہ اور بداطواری اُس کے نفس میں اس طرح شامل ہوگئی تھی، جیسے گرم پانی میں الکحل گھل مل جاتا ہے۔ توفیق سمجھتا تھا اور نہ صرف سمجھتا تھا، بلکہ اسپر یقین رکھتا تھا کہ دُنیا، بس ان ہی رنگینیوں اور

ہوس کاریوں کا نام ہے، کھاؤ، پیو، عیش کرو اور جب موت آئے، مسکراتے ہوئے مرجاؤ۔
آدمی کو صرف عیش وعشرت کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہے، جو زندگی عیش و مسرت سے خالی ہے
اُس کو زندگی کہنا، دراصل زندگی کی توہین ہے۔

توفیق کو گھر سے آئے ہوئے ایک سال کا عرصہ ہوگیا تھا، ابتدا میں تو اُس کو گھروالوں
کی اور خصوصاً شمشاد کی یاد آتی تھی، لیکن عیش و مسرّت کی زندگی نے، اب اُس کے حافظہ
سے عزیز واقارب کی یاد اور پچھلی زندگی کے تصورات کو یکسر محو کر دیا تھا، بس اب وہ تھا،
اور اُس کے تفریحی مشاغل ۔ عیاشی کی کثرت نے اُس کی صحت کو تباہ کرنا شروع کیا،
اور وہ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہوگیا۔ ایک مرض ہو تو اُس کا علاج بھی ہوسکتا ہے،
توفیق کا جسم تو امراض کی پوٹ بن گیا تھا، اُس کے اعصاب کی توانائی، آہستہ آہستہ جواب
دیتی جارہی تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کو پرہیز کرنیکی بہت کچھ تاکید کی، لیکن لذتوں اور مسرتوں
کی چاٹ نے، پرہیز کرنیکی صلاحیت ہی کب باقی رکھی تھی، ایک دو دن تو ڈاکٹروں کے کہنے
سننے سے وہ پرہیز کرتا، لیکن لذتوں کے تصورات اُس کو پھر اُبھارتے، اور وہ پرہیز توڑ دیتا،
بالکل اسی طرح جیسے، ایک بچہ کھلونے کو توڑ دیتا ہے۔

جوانی کا زمانہ تھا، بہت سے امراض کے حملے تو اُس نے ہنستے کھیلتے برداشت
کر لئے، لیکن گردہ کی تکلیف نے اُس کو نڈھال کر دیا۔ اب وہ چلنے پھرنے کے بھی قابل نہ
رہا تھا، ایکدن مکان میں بیہوش ہوگیا، اور اُسی حالت میں، اُس کے دوست اُسے
دواخانہ میں ڈال آئے۔ دواخانہ میں پہونچ کر اُسے ہوش آیا، تو وہاں کے در و دیوار
کو دیکھ کر وہ گھبرانے لگا، اب وہ ایک ایسے ماحول میں تھا، جہاں کی فضا مریضوں کی کراہ
دواؤں کی بُو اور پچکاریوں کی آواز سے معمور تھی۔ دواخانہ کی بعض نرسیں، یقیناً جاذب

نظر تھیں، لیکن گردہ کا مریض جمالیات سے لطف اندوز ہونیکے قابل کہاں رہتا ہے ڈاکٹروں نے اُس کا ہمدردی کیساتھ علاج کیا مگر حملہ بہت شدید تھا اور مرض نے نازک صورت اختیار کر لی تھی۔ توفیق کے دوستوں میں سے، دوچار دوست ابتدا میں تو اُس کے دیکھنے کیلئے آئے، لیکن کچھ دن کے بعد اُن کا آنا جانا بھی بند ہوگیا۔ توفیق کو بیماری میں اپنے بنگالی دوست کی یاد آئی، اُس نے بڑی خوشامد کے بعد، دواخانہ کے چپراسی کے ہاتھ دوست کے پاس خط بھیجا۔ چپراسی نے واپس آکر کہا کہ وہ صاحب، ایک مہینہ سے اپنے وطن گئے ہوئے ہیں۔ توفیق کی تکلیف میں اضافہ ہوتا جارہا تھا، عیش ولذت کے تصورات اب اُس کے لئے سوہانِ روح کا باعث تھے ایسے میں اُسے اپنے عزیزوں اور خصوصاً شمشاد کی یاد آئی، اُس نے شمشاد کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط لکھا:۔

پیارے شمشاد ۔۔ !

تم مجھ پر بے مروتی کا الزام لگا سکتے ہو، کہ میں تم کو بیمار چھوڑ کر چلا آیا۔۔ اور آنے کے بعد تم کو ایک خط بھی نہ لکھا، میں یقیناً خطاوار ہوں، مگر اب اس داستان کے دہرانے کا زمانہ نہیں رہا ۔۔۔ مجھے کچھ کہے سُنے بغیر اپنے قصور کا اعتراف ہے۔ میں اتنے دن کہاں رہا؟ کس طرح رہا؟ یہ تفصیلات بڑی ہی دردناک ہیں، جب تم سے ملاقات ہوگی تو مفصل عرض کروں گا۔ اب تو میں یہاں کے بڑے دواخانہ میں پڑا ہوا موت کا انتظار کر رہا ہوں، دنیا میں میرے لئے اب کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی، آہ دنیا کی مسرتیں کسدرجہ فانی اور عارضی ہیں؟ شمشاد میں نے ایک خواب دیکھا تھا، بہت ہی مختصر خواب، اُسکی تعبیر یہاں

دواخانہ میں دیکھ رہا ہوں۔

میرے والد کو میرا یہہ خط تم چاہو تو دکھا سکتے ہو، تم سے ملنے کو طبیعت چاہتی ہے، مگر میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے ملنے کے لئے غالباً نہ آسکو گے۔

دل بہت کچھ لکھنے کے لئے چاہتا ہے، مگر اتنی سطریں لکھنے میں سر چکرا گیا، سانس اُکھڑ گئی، مجبوراً تم سے رخصت ہوتا ہوں۔
شمشاد! خدا حافظ ــــ!

تمہارا نالائق دوست

توفیق

توفیق کے وطن سے چلے جانیکے بعد، اُس کے والدین اور عزیز و اقارب نے بہت کچھ اُس کی تلاش کی، لیکن توفیق کا پتہ نہ چل سکا، شمشاد کو بھی عزیز دوست کی اچانک جدائی کا بہت افسوس ہوا، اور اُس نے بھی جہاں تک اُس سے ممکن ہوسکا، توفیق کی جستجو کی، اُن لوگوں کے حاشیۂ خیال میں بھی یہہ بات نہ آسکتی تھی کہ توفیق، کلکتہ پہنچ کر ایسی زندگی اختیار کر سکتا ہے، جس میں شراب نوشی اور اُس کے تمام مکروہ لوازم داخل ہیں توفیق کے خط کو پڑھ کر، شمشاد کو دوست کے یکایک پتہ لگ جانیسے بڑی مسرت ہوئی، لیکن پردیس میں اُس کی کس مپرسی اور بیماری کا حال پڑھ کر بہت افسوس ہوا، شمشاد، توفیق کا خط لیکر توفیق کے گھر گیا، سب لوگوں کو شمشاد کی طرح، توفیق کے پتہ لگ جانے کی خوشی اور بیماری کی خبر سے فکر ہوئی۔

شمشاد کے والد ایک ہفتہ سے بیمار تھے، بخار تو اُتر گیا تھا، مگر کمزوری زیادہ تھی،

بوڑھے آدمی کو بیماری نے اور زیادہ چڑچڑا بنا دیا تھا۔ شمشاد نے جب باپ سے کلکتہ جانے کی اجازت چاہی، تو وہ بہت زیادہ بگڑنے لگے، شمشاد نے جیسے تیسے سمجھا بجھا کر باپ کو راضی کیا۔ اور توفیق کے باپ کے ہمراہ کلکتہ کو روانہ ہو گیا۔ تیسرے دن وہ دونوں کلکتہ پہنچ گئے، اسٹیشن سے اتر کر، قریب کے ہوٹل میں اسباب رکھا، اور سیدھے دواخانہ پہونچے۔ توفیق اپنے خط میں وارڈ اور کمرے کا نمبر لکھنا بھول گیا تھا، کلکتہ کا بڑا دواخانہ چھوٹی موٹی دنیا ہے، بڑی مشکل سے توفیق کا پتہ چلا۔ لیکن مصیبت یہ ہوئی۔ کہ مریضوں سے ملنے کا وقت ختم ہو چکا تھا، اور شمشاد اور توفیق کے باپ شیخ غلام علی کو توفیق کے وارڈ کے پہلے دروازہ پر روک دیا گیا۔ شمشاد نے ڈاکٹروں سے کہا:۔

یہ صحیح ہے کہ دواخانہ کے قانون وضابطہ کے مطابق اب باہر کے لوگ مریضوں سے نہیں مل سکتے، مگر دنیا کے ہر قانون میں کچھ نہ کچھ مستثنیات ضرور ہوتے ہیں، ہمارا عزیز آپ ہی لوگوں کے بقول بہت زیادہ بیمار ہے، پھر پورے ایکسال کے بعد اس کا پتہ لگا ہے۔ آپ اس مریض کے بوڑھے باپ کی حالت نہیں دیکھتے ہیں، کہ بیٹے سے ملنے کیلئے وہ کس قدر بے تاب ہیں، ہم ایک ہزار میل کا سفر کر کے آئے ہیں، ایسی صورت میں خدا کے لئے توفیق سے ہم کو مل لینے دیجئے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ ہمارے ملنے ملانے میں دو تین منٹ سے زیادہ وقت صرف نہیں ہو گا۔

مگر جس دنیا میں قانون وضابطہ کی صرف حکومت ہو، وہاں ایک پریشان حال انسان کی کون سنتا تھا، شام کے پانچ بجے تک دونوں کو انتظار کرنا پڑا۔ اور شام کو

بڑی بے تابی کیسا تھ دونوں، توفیق کے کمرے میں پہونچے۔ توفیق کا آپریشن ہوئے، آج دوسرا دن تھا، اُس کی کمر پر بہت سی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں، اور وہ معمولی حرکت کرنیکے بھی قابل نہ تھا۔ بوڑھے باپ، اور عزیز دوست کو دیکھ کر، اُس کے لاغر اور زرد چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی اُسی عالم میں اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے، رخساروں پر ڈھلک کر رہ گئے، باپ بیٹے کے ہونٹ چومنے کیلئے جھکا، قریب کھڑے ہوئے ڈاکٹر نے بوڑھے کو پکڑ لیا۔

یہ کیا کرتے ہو، مریض ہلنے جلنے کے قابل نہیں ہے، اور پھر ایسے مریض کے منہ کی بھاپ سے تو دور رہنا چاہیئے ـــ

ڈاکٹر نے قدرے تن کر جواب دیا۔ توفیق کچھ کہنا چاہتا تھا، اور اُس کے ہونٹوں کو ذرا جنبش بھی ہوئی، لیکن ناتوانی کا بُرا ہو، کہ اتنی ذراسی جنبش میں اُس کو چکر آگیا اب وہ بالکل غافل تھا۔ شیخ جی اور شمشاد کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب! میرے بچے کو کیا ہو گیا، کچھ فرمایئے ـــــــ تو سہی

ـــــــــــــــــــ شیخ جی نے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے کہا

اس مریض کے گردے خراب ہو گئے ہیں، کل اس کے گردوں کا آپریشن ہوا ہے، کمزوری بہت بڑھ گئی ہے کل سے کئی دفعہ غشی طاری ہو چکی ہے ـــ کوئی ایک مہینہ اچھے ہونے میں لگیگا۔ آج تو دوسرا ہی دن ہے ـــ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

ڈاکٹر صاحب! تو میرا بچہ ضرور اچھا ہو جائے گا

آپ کو یقین ہے ـــــــــــ شیخ جی نے ڈاکٹر کو محبت کی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ہاں! آپریشن تو کامیاب ہوا ہے، مگر مریض ابھی خطرہ سے باہر نہیں ہوا، پانچ دن گذر جانیکے بعد یقینی طور پر کوئی بات کہی جا سکتی ہے، بڑا نازک آپریشن تھا ـــــ اچھا، اب تم لوگ یہاں ایک منٹ بھی نہیں بیٹھ سکتے، ڈاکٹر گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ شمشاد اور توفیق کے باپ غلام علی کو مجبوراً وہاں سے چلا آنا پڑا۔

توفیق کو غش پر غش آ رہے تھے۔ رات میں اس کی حالت بہت زیادہ نازک ہوگئی، ڈاکٹر نے قوت پہونچانے کے لئے ہلکا سا انجکشن بھی دیا، مگر اب مصنوعی ذرائع سے قوت پہونچانے کا وقت گذر چکا تھا۔ رات کے ڈیڑھ بجے، توفیق نے چیخ ماری۔

"ابا جان! شمشاد! میں چلا"

"اچھا! آخری سلام۔!"

ڈاکٹر نے نبضوں پر ہاتھ رکھا، تو توفیق ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ ادھر توفیق نے آخری ہچکی لی، اور اُدھر توفیق کے باپ شیخ غلام علی، جن کی ابھی ابھی بڑی مشکل سے آنکھ لگی تھی، یکایک گھبرا کر چونک پڑے، اور شمشاد کو نیند سے جگا کر کہنے لگے۔

شمشاد! میں نے خواب دیکھا ہے، کہ توفیق مجھے اور تمہیں

سلام کر رہا ہے، اس انداز سے، جیسے وہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہا ہے اور ہاں! میں نے اس کو کفن میں لپٹا ہوا دیکھا ہے، شمشاد! میرا دل بیٹھا جاتا ہے، کسی طرح نہیں سنبھلتا۔ ہائیں! میرا بچہ ـــ!

شمشاد نے شیخ جی کو بہت کچھ تسلی دی مگر شیخ جی کی آنکھوں سے آنسو ایک منٹ منٹ کے لئے بھی نہ تھمے، دونوں کی رات یوں ہی روتے دھوتے بسر ہوئی، صبح کو دونوں دواخانہ پہونچے، اور وہاں پہونچتے ہی، یہہ روح فرسا خبر ملی کہ توفیق رات کے ایک بجے مرگیا، شیخ جی تو کمر پکڑ کر بیٹھ گئے، شمشاد کو بھی عزیز دوست کی موت کی خبر نے حیرت و غم کی تصویر بنا دیا۔

دواخانہ کی طرف سے توفیق کے کفن دفن کا سامان ہوا، جب توفیق کا جنازہ قبر میں اتارا جانے لگا ہے، تو شیخ جی دھڑام سے زمین پر گر پڑے، شمشاد نے شیخ جی کو اٹھایا۔ وہ خود فرطِ غم اور شدتِ الم سے نڈھال ہو رہا تھا، آخر کار دونوں نے توفیق کی قبر پر تھرتھراتے ہاتھوں سے مٹی ڈالی، اور جس کو لینے کے لئے وہ یہاں کلکتہ میں آئے تھے، اُس کو سپرد خاک کر کے، خالی ہاتھ واپس گئے۔

شمشاد اور توفیق کے باپ شیخ غلام علی، قیصر پور پہونچے، اور جب توفیق کے گھر والوں کو توفیق کی موت کا حال معلوم ہوا، تو سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ یہاں تو لوگ، توفیق کی آمد آمد کی خوشیاں منا رہے تھے، توفیق کی بوڑھی ماں نے میلاد شریف کے لئے، حلوائی کو مٹھائی کا آرڈر دیدیا تھا، شیخ جی کے گھر کی صفائی ہو رہی تھی۔ توفیق کی موت کی خبر نے خوشی اور مسرت کی بساط ہی اُلٹ دی، جو گھر ابھی تھوڑی دیر پہلے قہقہوں سے گونج رہا تھا، یکایک اُسکی فضا گریہ و بکا سے معمور ہوگئی۔

دفتر کی زندگی

توفیق کی موت نے شمشاد کو بیحد متاثر کیا۔ توفیق اور شمشاد بچپن کے ساتھی تھے، اسکول کی زندگی بھی ساتھ ہی گذری، جتنے دن توفیق، کلکتہ میں رہا، بس اتنے ہی دن دونوں میں جدائی رہی، شمشاد اپنی زندگی میں غیر معمولی کمی محسوس کر رہا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کسی نے اُس کی زندگی کے بنے بنائے خاکہ کو بے ترتیب بنا دیا۔ دن گذرتے گئے، اور اُس کے غم میں بھی کمی ہوتی گئی۔ توفیق کی جدائی کے نقوش مٹنے والے تو نہ تھے۔ مگر ہاں، دُنیا کی مصروفیات اور زمانہ کے مشاغل نے اُن کو دھندلا ضرور بنا دیا تھا۔

شمشاد نے ایک سال کے بعد میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کرلی، وہ اپنی تعلیم کو جاری رکھنا چاہتا تھا، لیکن اُس کے باپ نے ملازمت کے لئے مجبور کیا۔ اور اُسے کلکٹری میں ایک جگہ مل گئی۔ دفتر میں پہونچکر شمشاد کو بالکل ایک نئی دُنیا سے سابقہ پڑا، اور یہہ نئی دُنیا اُس کے لئے نہ صرف نئی تھی، بلکہ اس کی خودداری اور اُس کے کیریکٹر کی عظمت بالکل منافی تھی۔ اُس نے کلکٹری کے دفتر میں جاکر دیکھا کہ کوئی ڈپٹی کلکٹر جب دفتر کے برآمدے سے گذرتا ہے، تو دفتر کے کلرک اس طرح جُھک کر آداب بجالاتے ہیں، گویا یہہ لوگ عنقریب سجدے میں گرنیوالے ہیں۔ مندر میں کوئی برہمن بھی شاید اس عقیدت کیساتھ مہادیو کے سامنے ڈنڈوت نہ کرتا ہوگا۔

کسی عہدیدار نے کسی اہلکار (کلرک) کے بُلانے کے لئے چپراسی کو بھیجا، اُدھر چپراسی

کے مُنہ سے دو بول نکلے، اور ادہر اہلکار۔ اس طرح گھبرا کر دوڑا جیسے کہ عرش سے سچ مچ وحی نازل ہوئی ہے، اور اگر ایک سیکنڈ کی بھی دیر ہوگئی تو جان اور ایمان دونوں کی خیر نہیں

دفتر کے ملازمین عہدیداروں سے اس قدر فروتنی، عقیدت، انکسار اور خوف کیساتھ ملتے تھے، گویا کہ ان لوگوں کی قسمت کے یہہ عہدیدار ہی مالک ہیں، اور اُن کے رزق کی کُنجی ان ہی حاکموں کے ہاتھ میں ہے۔ یہہ لوگ عہدیداروں کو خدا تو نہ سمجھتے تھے، مگر ایک انسان خدا کی جتنی عظمت کر سکتا ہے، اور خدا سے جس قدر ڈر سکتا ہے۔ اُس سے کچھ زیادہ ہی عہدیداروں کی عظمت کیجاتی تھی، اور اُن سے ڈرا جاتا ہے۔

دفتر کے اہلکار، دفتری کارروائیوں میں عہدیداروں کے ناموں کیساتھ بڑے بڑے القاب لکھتے تھے، اور رخصت اور ترقی وغیرہ کی درخواستوں میں تو اُن عہدیداروں کو،

"خداوند نعمت، فیض بخش فیض رساں، حاتم دوراں، دام اقبالکم" اور نہ جانے کیا کیا لکھا جاتا تھا۔ اور یہہ اہلکار اپنے کو "فرمانبردار، خاکسار، کمترین" لکھتے تھے، دفتری کارروائیوں میں، اہلکاروں کی طرف سے، اس انداز میں گزارشیں اور یادداشتیں پیش ہوتی تھیں۔ گویا یہہ لوگ اپنے لئے عہدیداروں سے گڑگڑا کر بھیک مانگ رہے ہیں۔ دفتر کی تمام امثلہ نیازمندی اور عقیدت کے ان ہی بے پناہ مظاہروں سے بھری پڑی تھیں، اور اسی خاکساری فروتنی خودناشناسی اور ذلتِ نفس کا نام "ڈسپلن" تھا۔ کس کی مجال تھی، جو اِس "ڈسپلن" کے خلاف، ایک حرف بھی منہ سے نکال سکے۔

دفتر کی زندگی کو دیکھہ کر، شمشاد نے بڑا دکھ محسوس کیا۔ دفتر کیا تھا اچھا خاصہ بُت کدہ تھا، جہاں بہت سے مہذب پجاری، بُتوں کی پوجا کرتے تھے۔ ملازمین نے اپنے ضمیروں اور ایمانوں کو، بہت ہی سستے داموں پر بیچ دیا تھا۔ انسانیت کی عظمت، پناہ ڈھونڈ رہی

تھی، اور اس کو کوئی پناہ دینے والا بھی نہ تھا۔ گرمی کے زمانہ میں، عہدیداروں کے کمروں کا دروازوں پر خس کی ٹٹیاں لگائی جاتیں، چپراسی ان پر پانی چھڑکتے، اور مزدور پنکھا کھینچتے، لیکن اہلکاروں کے کمرے، گرم ہوا کے تھپیڑوں کے لئے وقف تھے، وہاں نہ تو خس کی ٹٹیاں تھیں، نہ پنکھے تھے، یہہ لوگ دن بھر گرم ہواؤں میں جھلستے، اور حیرت تو اس پر ہے کہ اس حالت میں وہ لوگ مطمئن اور خوش و خرم تھے، ان لوگوں کا نفس اتنا ذلیل ہوگیا تھا، کہ انھوں نے خود بخود فرض کرلیا تھا، کہ ان کیساتھ ایسا سلوک ہونا ہی چاہیئے، اور اس امتیاز سے، ان کی عزت میں کوئی فرق نہیں آتا، ان کی خودداری ذرہ برابر متاثر نہیں ہوتی ۔

اہلکاروں کی زندگی، بالکل چوپایوں کی زندگی تھی، اور یہہ سب کچھ اہلکاروں کا ہی کیا دھرا تھا، ان ہی نے اپنے کو اس قدر ذلیل اور کمینہ بنا لیا تھا، ورنہ اگر وہ لوگ ذرا بھی خودداری اور عظمتِ نفس سے کام لیتے تو عہدیداروں کو خدائی کرنے کا موقعہ ہی نہ ملتا۔

ان ہی کلرکوں نے خوشامد اور تعریف کرکے، عہدیداروں کو عرش سے بھی کچھ اوپر پڑھا دیا تھا۔ ایک مرتبہ ایک عہدیدار کی ترقی ہوئی، اس کی ترقی کی خوشی میں، دفتر والوں کی طرف سے شاندار پارٹی دیگئی، دفتر کے ملازمین نے عہدیدار کی تعریف میں جو قصیدے پڑھے ہیں اور تقریریں کی ہیں، ان کا خلاصہ یہہ تھا کہ :۔

> آپ عدل و انصاف میں رشکِ نوشیرواں، جود و سخاوت میں غیرتِ حاتم، بہادری اور دلیری میں رستم ثانی ہیں۔ اپنے ماتحتوں پر ماں باپ سے زیادہ مہربان ہیں، فراست و تدبر میں افلاطون و بقراط کے جانشین اور علم و کمال میں بوعلی سینا اور برنارڈشا کی مثال ہیں ــــ

ان عہدیدار صاحب کا چہرہ اُلٹے توے کی طرح کالا تھا، اُس پر چیچک کے گہرے داغ تھے، ایک صاحب نے قصیدے میں اُن کے حُسن پر جو تبصرہ کیا ہے، اُس کا خلاصہ نثر میں پیش کیا جاتا ہے:۔

آپ کا چہرہ آفتاب اور ماہتاب کو شرماتا ہے، خدا نے حُسنِ سیرت کیساتھ، آپ کو حُسن صورت بھی عطا فرمایا ہے، آپ یوسفِ ثانی ہیں۔ آپ مُسکراتے ہیں تو بجلیاں کوندنے لگتی ہیں۔

یہی عہدیدار صاحب، نہایت ہی غریب گھرانے کے تھے، اُن کا باپ سُنتے ہیں کہ گورنر کے یہاں خانساماں تھا، سفارشوں کی بناء پر ان کو عہدہ مل گیا۔ ان کے خاندانی حالات کا بھی، ایک صاحب نے اپنی تقریر میں ذکر فرمایا:۔۔۔

حضرات! ہمارے ممدوح، خدا کے فضل سے خاندانی عزت و وجاہت کے مالک ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب شیرشاہ سوری تک پہونچتا ہے، سُنا ہے کہ آپ کے جدِ امجد، شاہ عالم کے زمانہ میں قاضی القضاۃ تھے، آپ کے خاندان کو سلطنتِ مغلیہ کی طرف سے جاگیر عطا ہوئی تھی جو غدر کے زمانہ میں چھن گئی۔ حکومت کو ایسے خاندانی امیر اور صاحبِ جاہ و عظمت انسان کی قدر کرنی ہی چاہیئے تھی۔

شمشاد ان باتوں کو دیکھ کر جی ہی جی میں کُڑھتا تھا۔ اور یہہ زندگی اُس کیلئے رُوح فرسا اور تکلیف دہ تھی وہ عہدیداروں کے پاس جانیسے گریز کرتا تھا، جب کسی ناگزیر ضرورت کی بناء پر کسی عہدیدار کا سامنا ہو جاتا، تو وہ ایک شریف اور خوددار انسان کی طرح سلام کر لیتا۔ شمشاد تو عہدیداروں کے ناموں کیساتھ القاب و آداب کے دُم چھلے لگاتا تھا

اور نہ اپنے نام کا "کمترین، خاکسار، فرمانبردار، خادم" کیساتھ پیوند جوڑتا تھا،

ایک مرتبہ شمشاد نے رخصت کی درخواست پیش کی، جس میں افسر متعلقہ کو صرف "جناب اور صاحب" کے القاب سے یاد کیا، اور اپنا نام بغیر "کمترین اور خاکسار" کے ذلیل دُم چھلے کے لکھا۔ درخواست قاعدہ کے مطابق صیغہ کے منتظم (آفس سپرنٹنڈنٹ) کے سامنے پیش ہوئی، اس نئی قسم کی درخواست کو دیکھ کر، منتظم نے شمشاد کو چپراسی بھیجکر بلایا۔

یہہ آپ ہی کی درخواست ہے کیا ۔۔۔ ؟ ۔۔۔ منتظم نے عینک، ناک کی نوک پر رکھتے ہوئے کہا۔

جی ہاں! یہہ میری ہی درخواست ہے ۔۔۔ شمشاد نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

مانا کہ آپ نئے نئے ملازم ہوئے ہیں، اور دفتر کے آداب سے واقف نہیں ہیں، مگر آپ دوسرے لوگوں سے پوچھ کر درخواست لکھ سکتے تھے، دفتری کارروائیوں میں تو دوسرے لوگوں سے پوچھے بغیر کام ہی نہیں چل سکتا۔ نئے آدمی، پرانے آدمیوں سے پوچھ کر ہی کام سے واقف ہوتے ہیں ۔۔۔ منتظم پنسل گھماتے ہوئے بولا۔

میں تو ہمیشہ اپنے ساتھیوں سے جب کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تو پوچھ لیتا ہوں، لیکن درخواست کی معمولی سی عبارت کے لئے کسی سے پوچھنے گچھنے کی کیا ضرورت تھی ۔۔۔ شمشاد نے جواب دیا۔

تو آپ اپنے متعلق حُسنِ ظن بھی رکھتے ہیں ۔۔۔ سبحان اللہ!

چشم بد دور! جناب مولوی صاحب قبلہ! اگر یہہ درخواست میں یوں ہی افسر متعلقہ کے پاس بھیجدیتا، تو میری اور آپ کی دونوں کی شامت آجاتی ۔ آپ کو تو دفتر میں آئے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے، لیکن میری تو پورے بیس سال کی ملازمت پر حرف آجاتا ـــــــــــــــــــ منتظم قدرے سختی کیساتھ بولا ۔

آخر معلوم بھی ہو تو کہ میری لکھی ہوئی درخواست میں کیا خرابی رہ گئی ہیں، ـــــــــــــــــــ شمشاد نے انتہائی سادگی کیساتھ کہا ۔

بڑے بڑے نادانوں سے اس دنیا میں سابقہ پڑتا ہے، ارے میاں! آپ نے درخواست تھوڑی لکھی ہے، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ جیسے کوئی عہدیدار، اپنے برابر کے عہدیدار کو کوئی یادداشت لکھ رہا ہے ۔

(منتظم درخواستوں کی فائل شمشاد کے سامنے رکھہ دیتا ہے)

یہہ دیکھو! درخواستیں اسی طرح لکھی جاتی ہیں ۔ عبارت کا انداز اور مخاطبت کا یہہ طریقہ ہے ـــــــــــــــــــ منتظم شمشاد کیطرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا ۔

اس پر شمشاد نے دو چار درخواستوں کو غور سے پڑھا ۔ وہ ابھی مطالعہ میں مصروف

ہی تھا کہ آفس سپرنٹنڈنٹ (منتظم) نے کرسی سے قدرے اُٹھتے ہوئے کہا :۔

پڑھ چکے درخواستیں ! سمجھ گئے، دفتری آداب ! جاؤ اس درخواست کو چاک کر ڈالو، دوسری درخواست لکھہ کر لاؤ ۔ اور ہاں ! دیکھنا، ذرا ہاتھ روک کر لکھنا، حاکم لوگ ذرا سی بات پر بگڑ جاتے ہیں۔ ہم کو اپنی طرف سے ایسا موقعہ ہی نہ دینا چاہیئے کہ حکام کو کچھ کہنے سُننے کی ضرورت پڑے۔

شمشاد نے ۔ درخواستوں کی مثل ——— اُلٹ کر رکھہ دی، اور منتظم کو مخاطب کرتے ہوئے بولا ۔

جی ہاں ! درخواستیں پڑھ چکا، مگر میں دُنیا میں کسی انسان کو بھی "خداوند نعمت" لکھنے کے لئے تیار نہیں ہوں ۔ اور نہ میں محض دُنیوی جاہ و عزت کے اعتبار سے، دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں اپنے کو کمترین اور "خاکسار" سمجھتا ہوں ——

شمشاد کے جواب پر، منتظم کا منہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا، اُس نے کسی اہلکار سے آج تک اس قسم کا جواب سُنا ہی نہ تھا ۔ اُس نے قدرے گھبراہٹ کیساتھ کہا ۔

آپ نوکری کرنے آئے ہیں، یا بادشاہت کرنے کے لئے آئے ہیں ۔ دفتری آداب کی پابندی آپ کو کرنی چاہیئے ۔ جب آپ گھر سے نوکری کرنے کے لئے نکلے ہیں، تو اپنے سے بڑوں کا ادب بھی کرنا پڑیگا ۔ اور خود کو چھوٹا سمجھنا ہوگا ۔

شمشاد، منتظم کے اس جواب پر مُسکرایا، وہ تھوڑی دیر تک کھانستا رہا اُس کے بعد

جواب دیا:۔

جی ہاں! میں نوکری کرنے کے لئے ہی آیا ہوں، بادشاہت کرنے کے لئے نہیں آیا۔ لیکن نوکری کے معنیٰ غلامی کے نہیں ہیں، میں نے ملازم ہوکر اپنے ضمیر اور خودداری کو فروخت نہیں کردیا۔

اپنے عہدیداروں کو میں "جناب اور صاحب" لکھتا ہوں اور جہاں تک دفتری کام اور اُس کے فرائض کا تعلق ہے، میں نے اب تک کوتاہی نہیں کی۔ اور میں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ میں نے اپنے کسی عہدیدار کے ادب کو نہیں گھٹایا۔

اس پر منتظم نے کہا:۔

آپ تو بڑے سرکش معلوم ہوتے ہیں، آپ کے خیالات تو بالکل اشتراکیوں جیسے ہیں! کیا روس کا سفر کیا ہے آپ نے؟

شمشاد نے ٹوپی کا پھندنا گھماتے ہوئے جواب دیا:۔

خودداری کا نام سرکشی نہیں ہے۔ منتظم صاحب معاف فرمائیے آپ نے سرکشی اور خودداری کو سمجھنے کی غالباً کوشش نہیں فرمائی۔

میں نے نہ تو روس کا سفر کیا ہے، اور نہ میں اشتراکی خیال رکھتا ہوں، میں نے صرف اخباروں میں یہہ لفظ پڑھا۔ مجھے اشتراکی دستور اور روس کی موجودہ حکومت کا ذرا بھی علم نہیں ہے، لیکن خودداری کا احساس اور اپنی آپ عزت کرنا، تو ہر انسان کی فطرت اور جبلت میں داخل ہے۔ اگر آپ اس کو اشتراکیت سمجھتے ہیں تو یہہ ہی سمجھ لیجئے۔

الفاظ کے اُلٹ پھیر سے حقیقت تو نہیں بدلی۔

شمشاد کی باتوں سے منتظم کو بھی حیرت ہو رہی تھی، اور اُس کے چہرے پر خفگی اور عتاب کے آثار بھی پیدا ہوتے جا رہے تھے۔

تو پھر آپ نے یہہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ اس درخواست کو نہیں بدلیں گے ———— منتظم پیشانی کی سلوٹ پر اُنگلی رکھتے ہوئے بولا۔

جی ہاں! یہہ میرا ناقابلِ تبدیل فیصلہ ہے، میں اِس درخواست میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ شمشاد نے جواب دیا۔

دیکھئے! میں آپ کو پھر سمجھاتا ہوں، جوانی کے زور میں لگی ہوئی نوکری پر لات نہ ماریئے، بہت بُرا زمانہ ہے بی۔ اے۔ ایم۔ اے نوکری کے لئے دربدر مارے مارے پھرتے ہیں، اس لگے ہوئے روزگار کی قدر کیجئے۔

صاحب! بہت تیز مزاج ہیں، آپ کی باتوں کی خبر ہو گئی تو فوراً برطرف کر دیں گے ———— منتظم نے قدرے ملایم لہجہ میں کہا۔

آپ کی ہمدردی اور بزرگانہ شفقت کا بہت بہت شکریہ! لیکن میں آپ کے "صاحب" کو رازق نہیں سمجھتا، جو خدا آپ کو اور آپ کے "صاحب" کو کھانے کو دیتا ہے، وہی میرے کھانے کا نہ صرف کفیل ہے، بلکہ مجھے

پیدا کرنیسے پہلے اُس نے اپنے آپ کو میرے رزق کا ذمہ دار بنایا ہے، میں جہاں بھی رہوں گا، مجھے میری قسمت کا ضرور ملیگا۔

میں تو ملازمت کو نہیں ٹھکرا رہا ہوں، لیکن ملازمت اگر ذلتِ نفس اور ضمیر کی غلامی کا نام ہے، تو ایسی نوکری سے فاقے کرنا بھلا! دُنیا میں کوئی شخص خودداری کی قیمت ادا نہیں کر سکتا جب یہہ جوہر باقی نہ رہے تو پھر انسان اور کُتّے میں کیا فرق ہے۔ اور میں چند ٹکڑوں کے لئے کُتّا بننا پسند نہیں کرتا ـــــــ شمشاد نے ایک ایک لفظ کو آہستہ آہستہ ادا کیا۔

مسٹر شمشاد! آپ بالکل بغاوت پر اُتر آئے ہیں، اور بڑی ناسمجھی کی باتیں کر رہے ہیں۔ اس دفتر میں کلرکوں کی تعداد پچاس سے اوپر ہی ہوگئی، کیا آپکے خیال میں یہہ سب کے سب ذلیل اور ضمیر فروش ہیں؟ میاں! آدمی کو چاہئیے کہ جس جگہ جائے گھُل مِل کر رہے ـــ منتظم قلم سے کان کھجلاتے ہوئے بولا۔

بات تو میں بہت سمجھ کی کہ رہا ہوں، مگر اس کو کیا کیا جائے، کہ آپ نے جس ماحول میں اپنی زندگی کے بیس سال گذارے ہیں، اُس سے آپ ایک قدم باہر آنا نہیں چاہتے۔

اگر اس دفتر کے سب اہلکار، یہاں کے

عہدیداروں کو خداوند نعمت، ان داتا اور اپنی قسمتوں کا مالک سمجھتے ہیں، تو آپ خود ہی انصاف سے بتایئے کہ ان لوگوں کو کیا کہا جائے گا؟ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو:۔

"زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز"

پر عقیدہ رکھتے ہیں، میرا تو یہ ایمان ہے:۔

گفتند جہانِ ما، آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن

لوگ کہتے ہیں کہ "جیسا دیس ویسا بھیس" میں کہتا ہوں کہ اگر دیس اچھا ہے تو اُس کا بھیس ضرور اختیار کر لینا چاہیئے اور اگر دیس بُرا ہے تو اُس دیس کے بھیس کو اگر پارہ پارہ کرنے کی ہمت نہ ہو، تو کم سے کم اُسکے پہننے سے گریز کرنا چاہیئے منتظم صاحب! زندگی کھانے پینے، پہننے اور لکھنے پڑھنے کا نام نہیں ہے۔ زندگی صرف عظمت کردار اور آزادئ ضمیر کا نام ہے، یہ چیز چلی گئی، تو بس سمجھ لو کہ آدمی مر گیا۔ اب اُسکی مثال، پتھر کے ٹکڑے کی ہے، کہ ہر چلنے والا اپنی ٹھوکر سے اُسے جہاں چاہے پھینکدیتا ہے۔ شمشاد نے میز پر کہنی ٹیکتے ہوئے جواب دیا۔

اچھا۔ ! معلوم ہوا، آپ اپنی تباہی کے درپے
ہیں خیر۔ ! جائیے، اپنے کمرے میں جائیے، زیادہ نصیحت
کرنے کی ضرورت نہیں۔

منتظم یہہ جملے دُہراتے ہوئے، کاغذ پر پنسل سے لکیریں کھینچنے لگا، اور شمشاد
وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا۔

ذرا سی دیر میں، یہہ خبر بجلی کی طرح سارے دفتر میں دوڑ گئی اور بعض خوشامدیوں
نے متعلقہ عہدیدار تک اس خبر کو خوب نمک مرچ لگا کر پہونچادیا، عہدیدار نے آفس
سپرنٹنڈنٹ کو بلُایا۔ منتظم نے عہدیدار کے دریافت کرنے پر، اپنی اور شمشاد کی ساری
گفتگو دہرا دی۔ شمشاد کی لکھی ہوئی درخواست بھی عہدیدار نے عتاب و اشتباہ
کی نظروں سے دیکھی۔ حاکم نے دفتر کے بعض لوگوں سے شمشاد کے متعلق دریافت کیا تو
اُن خوشامدیوں نے غریب شمشاد کی مخالفت میں دفتر کے دفتر بیان کر ڈالے، انہوں
نے کہا:۔

خداوند نعمت۔ ! اس لڑکے کو روٹیاں لگ گئی ہیں، اپنے کو ملکی لاٹ کا
بھی باوا سمجھتا ہے۔ پرسوں چھوٹے ڈپٹی صاحب کو اس نے میرے سامنے اس طرح سلام
کیا، جیسے ڈپٹی صاحب اس کے لنگوٹیا یار ہیں۔

حضور والا ! یہہ لونڈا تو دفتر کے کلرکوں سے کسی دن اسٹرائیک یا ستیاگرہ
کرا کے رہیگا، اور کیا عجب ہے کہ سب کو بغاوت پر آمادہ کردے۔ روزانہ لیکچر دیا
کرتا ہے کہ سب انسان برابر ہیں، مال دولت اور عہدے سے کوئی انسان، کسی سے
بڑھ نہیں جاتا جس شخص کے اخلاق اچھے ہیں۔ اور جو خدا ترس اور راست باز

وہی خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا ہے۔

اور ہاں سرکار! کوئی ایک ہفتہ ہوا تو یہہ شمشاد ایک تاریخ کی کتاب لیکر آیا تھا، جس میں سے اُس نے پڑھکر سنایا کہ شکستہ حال مسلمان، بادشاہوں کے درباروں میں دندناتے چلے گئے، اور ایک پھٹے حال اعرابی نے حضرت عمر فاروق کا گریبان تھام لیا۔

تو حضور —— ! اِن باتوں سے اُس کا یہی مقصد ہے کہ دفتر کے لوگ، عہدیداروں کے ادب آداب میں کمی کر دیں، اور اُن سے جُھک کر نہ ملیں، اُن کے مقابلہ میں اپنے کو کم نہ سمجھیں۔

سرکارِ عالی جاہ! ایک دن تو یہہ شمشاد کہہ رہا تھا، کہ انسان کو صرف خدا سے ڈرنا چاہیئے، بندوں کا ڈر اور خدا کا ڈر ایک دل میں نہیں سما سکتے۔

اور ہاں! بات بات پر تو یہہ کل کا لونڈا قرآن کی آیتیں، حدیثیں اور بزرگوں کے قول پیش کرتا ہے۔

خداوند نعمت! یہہ چھوکرا سارے دفتر کو خراب کر کے چھوڑیگا۔ ایک دن کہہ رہا تھا کہ آپکی گرمیوں سے پہلے، دفتر کے کلرکوں کو درخواست دینی چاہیئے کہ اُن کے کمروں کے دروازوں پر بھی خس کی ٹٹیاں لگائی جائیں، یہہ تو ہر بات میں معزز عہدیداروں کی برابری کرنا چاہتا ہے۔

اور سرکار! یہہ اگر کچھ دن اور دفتر میں رہ گیا، تو دفتر کے ذلیل چپراسی، اہلکاروں کی برابری کرنے لگیں گے عہد

کے بعد جو دفتر کھلا، تو یہہ شمشاد ایک ایک چپراسی سے گلے ملا، بڑی گرمجوشی اور تپاک کیساتھ، جیسے کہ یہہ اس کے بھائی بند ہیں

اور حضور! یہہ اپنے کو بڑا ایماندار اور پارسا سمجھتا ہے۔
کوئی شخص ایک دن اس کے پاس کہیں سے خط لیکر آیا۔ اُسے خط کا جواب دینا تھا، تو اس نے اُس آدمی کے ہاتھ دو پیسے بھیجکر لفافہ اور خط کا کاغذ بازار سے مول منگوایا۔ میں نے اُس سے بہت کچھ کہا کہ بھئی! دفتری کاغذ پر خط لکھ دو، مگر اُس نے کہا کہ میں اس کو خیانت سمجھتا ہوں۔

اور خدا جانے! یہہ ظالم کیا مقوی دوا کھاکر آتا ہے، کہ دفتر کے پورے اوقات میں کام کرتا ہے، بس نماز کے لئے تو ضرور اُٹھ جاتا ہے ورنہ جب دیکھو، سامنے مسلیں رکھی ہیں، اور یہہ مطالعہ میں ڈوبا ہوا ہے،

عہدیدار ان باتوں کو سُن رہا تھا، اور اُس کے ماتھے پر عتاب کی شدت سے سلوٹیں اُبھری چلی آرہی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کسی نے اُسے تیز سرکہ کی دو چار بوتلیں پلادی ہیں۔ اُس نے گھنٹی بجائی، چپراسی دوڑتا ہوا آیا۔

"شمشاد حسین کو بُلا کر لاؤ"

عہدیدار نے انتہائی غرور و تکبر کے انداز میں کہا، اور پائیپ ہونٹوں میں دبا کر دھواں اُڑانے لگا۔ چپراسی نے شمشاد سے کہا کہ "صاحب، بُلاتے ہیں" شمشاد اُس کے کہنے پر، عہدیدار کے کمرے میں پہونچا۔ اور اُس نے خوددار انسان کی طرح

سلام کیا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ شمشاد کے سلام کے انداز نے ہی عہدیدار کو گرما دیا تھا، اب جو وہ بغیر اجازت کے کرسی پر بیٹھا ہے، تو "صاحب" کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔

ایں — ! تم کرسی پر میری اجازت کے بغیر بیٹھ گئے، اس قدر گستاخ ہو تم — ! —— عہدیدار غصہ کیساتھ بولا۔

کرسی پر بیٹھنے کے لئے تو اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ خالی کرسیاں تو انسانوں کے بیٹھنے کے لئے ہی رکھی جاتی ہیں —— شمشاد نے انتہائی متانت کیساتھ جواب دیا

لیکن تم تو میرے ماتحت ہو —— عہدیدار نے کہا۔

جی ہاں ! میں آپ کا ماتحت ہوں، آپ میرے افسر ہیں، مگر کرسی پر بیٹھنے اور آپ کے ماتحت ہونے میں، وجہ اختلاف آخر کیا ہے ؟ —— شمشاد نے جواب دیا

تم دیکھتے نہیں ہو کہ سو سو دو دو سو ماہوار پانے والے ہمارے سامنے کھڑے رہتے ہیں، تم نے تو ابھی ابتدائی گریڈ بھی پورا نہیں کیا —— عہدیدار نے کہا۔

مجھے نہیں معلوم کہ وہ لوگ کس لئے کھڑے رہتے ہیں، وہ اپنے فعل کے ذمہ دار ہیں —— شمشاد نے شیروانی

کا بٹن گھماتے ہوئے
جواب دیا۔

تم بہت ہی زیادہ گستاخ معلوم ہوتے ہو،
عہدیداروں کے سامنے ماتحت کرسی پر نہیں بیٹھا
کرتے، یہہ دفتری دستور ہے، آداب ہے، ڈسپلن ہے۔ عہدیدار پایپ
میز پر رکھتے ہوئے بولا

جناب! اس دفتری دستور کی پابندی کرنے
کے لئے میں تیار نہیں ہوں۔ اور نہ میں ایسا ذلیل ماتحت
بننا چاہتا ہوں ——— شمشاد نے وقار و متانت
کیساتھ کہا۔

دفتر کے لوگوں نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ شمشاد حسین
دفتر کے ڈسپلن کی ہر بات میں مخالفت کرتے ہیں۔ عہدیدار نے جواب دیا۔
میں نے تو دفتر کے ڈسپلن کی کبھی مخالفت نہیں کی۔
جس نے بھی آپ سے کہا، غلط کہا ——— شمشاد نے ہتھیلی میز
پر پھیرتے ہوئے کہا۔

شمشاد حسین! تمھارے طور طریق ٹھیک نہیں
ہیں، دیکھو! تمھاری رفتار اور گفتار سے غرور ٹپکتا ہے،
تم ابھی ناتجربہ کار ہو، نوکری میں جھک کر رہنا پڑتا ہے،
عہدیداروں کی عزت ہی میں ماتحت کی بھلائی ہے، تم

نے تھوڑی سی دیر میں دو غلطیاں کیں، اول تو مجھے اس

انداز کیسا تھ سلام کیا، جیسے تم میرے برابر کے عہدیدار

ہو، اُس کے بعد بغیر اجازت کے کرسی پر بیٹھ گئے، کیا تم

نے دفتر کے لوگوں کو سلام کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ عہدیدار عینک کا

گھر ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا

میں ملازمت کرنے کے لئے آیا ہوں، غلامی اور

بندگی کرنے کے لئے نہیں آیا۔ میں کسی انسان کو جھک کر

سلام نہیں کرتا۔ یہہ میرے مذہب کی تعلیم ہے۔ شمشاد نے جواب دیا۔

تو تم نے دفتر کے ڈسپلن کی مخالفت کا پکا ارادہ

کرلیا ہے، آج ہی تمھارے ہاتھ کی لکھی ہوئی درخواست

میرے ملاحظہ سے گذری ہے، اس میں بھی یہی اسپرٹ

جھلکتی ہے ——————— عہدیدار مونچھوں کو تاؤ

دیتے ہوئے بولا۔

جناب! معاف فرمائیے آپ نے جس چیز کا نام

دفتری ڈسپلن رکھ چھوڑا ہے، اس کو دفتر کے ڈسپلن

سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے، عہدیداروں کو جُھک کر

سلام کرنا، اُن کے سامنے غلاموں کی طرح کھڑا رہنا۔

اُن کو خداوند نعمت اور ان داتا، لکھنا، کیا اسی کا نام

آپ کی لغت میں ڈسپلن ہے۔ اگر اسی کا نام آپنے

ڈسپلن رکھا ہے، تو میں اس ڈسپلن کے ماننے کے لئے تیار
نہیں ہوں۔ اور میں کیا کوئی شریف اور خود دار آدمی
ایسی انسانیت سوز ڈسپلن کے قیام میں مدد نہیں دیسکتا۔ شمشاد نے بیباکی
کیساتھ جواب دیا۔

شمشاد! میں نے اب تک تم کو اپنا ماتحت سمجھ کر
سمجھانے کی کوشش کی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم سیدھے
طریقہ سے سمجھنے والے نہیں ہو۔
میں تم کو ایک ہفتہ کی مہلت دیتا ہوں، اس
عرصہ میں اپنے رویہ کو درست کر لو ——— عہدیدار نتھنے پھلا کر
بولا۔

مجھے تو اپنے رویہ میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی،
پھر مجھے مہلت دینے کی کیا ضرورت ہے ——— شمشاد نے جواب دیا۔
شمشاد! تم میری ایک معمولی سی رپورٹ
پر برخاست ہو سکتے ہو، دیکھو! اب بھی کچھ نہیں بگڑا
مجھے تمھاری جوانی پر رحم آتا ہے، ——— عہدیدار نے کہا
آپ کی مہربانی کا شکریہ، مگر ایسے دفتر میں
جہاں کا ڈسپلن، انسان کی عظمت کو ذلیل بناتا
ہو، جہاں بہت سے خداؤں کی پوجا کیجاتی ہو، جہاں کے
آداب کا نام خوشامد، چاپلوسی، اور ذلت نفس ہو، اُس

دفتر میں ایک شریف اور خوددار انسان بھلا کس طرح
رہ سکتا ہے، آپ شوق سے میرے خلاف رپورٹ کر سکتے
ہیں ——————— شمشاد نے شیروانی
کا کالر چھوتے ہوئے کہا

اچھا۔! تم میرے کمرے سے فوراً چلے جاؤ،
پرسوں تم کو تمہارا اعمالنامہ مل جائے گا ——— عہدیدار نے انتہائی
غصہ کیساتھ جواب دیا۔

آپ کے اخلاق کا بہت بہت شکریہ! آپنے
بلایا تھا، حاضر ہوگیا، آپ چلے جانے کے لئے کہتے ہیں
جاتا ہوں۔ مگر میرے پاس میرا اعمالنامہ بھیجنے کی کیا
ضرورت ہے ——— اچھا۔! آداب عرض ہے۔

شمشاد یہہ کہتے ہوئے، عہدیدار کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ دفتر کے لوگ
نپے کمروں میں سے جھانک رہے تھے کہ دیکھئے کیا گل کھلتا ہے؟ شمشاد کو مطمئن پاکر اُن کو
حیرت ہوئی شمشاد نے اپنی جگہ پر آکر استعفا لکھ کر پیش کردیا، جو بہت زیادہ مختصر
تھا، مگر اُس کا ایک ایک لفظ اہلِ بصیرت کیلئے سرمایۂ عبرت تھا، اُس نے اپنے پیش کئے
ہوئے استعفیٰ میں لکھا،

عزتِ نفس اور خودداری کی دُنیا میں کوئی قیمت ادا نہیں
کرسکتا۔ زندگی صرف "عزتِ نفس" کا نام ہے، یہہ جاتی رہی تو زندگی
بھی ختم ہوگئی، کوئی عقلمند اور ذی ہوش انسان، اپنے ہاتھوں اپنی

زندگی ختم نہیں کرسکتا۔

پیٹ کا مسئلہ اور روزگار کا سوال اپنی جگہ بہت اہم ہے، مگر عزتِ نفس، اس سے بہت زیادہ اہم اور بلند تر ہے۔ پیٹ بھرنے کے لئے ذلتیں اُٹھانا، اپنے جیسے ادیبوں کو پُوجا کرنا، متکبر اور مغرور انسانوں کے مقابلے میں اپنے کو ذلیل سمجھنا، ذلتِ نفس اور توہینِ انسانیت کی بدترین مثال ہے، اس ذہنیت کے آدمی کی زندگی، اور کُتّے کی زندگی کے درمیان، مشکل ہی سے کوئی حدِ فاصل قایم کیجا سکیگی۔

میں اُس مردود ڈسپلن کی پابندی نہیں کرسکتا، جو دل و دماغ کو غلامی کے تصورات کا پابند بناتا ہو — میں عزت کی زندگی چاہتا ہوں، وہ پھُول کی سیج کی بجائے، کانٹوں کے فرش پر ہی کیوں نہ حاصل ہو۔

میں استعفاء دیتے ہوئے، بڑی مسرت اور اطمینان محسوس کررہا ہوں، اُس خدا کا ہزار ہزار شکر ہے، جس نے مجھ میں زندہ رہنے کی جُرات پیدا کی۔

آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

کچہری کے عہدیدار اس استعفے کو پڑھکر سکتے میں رہ گئے، اُن کے خواب و خیال میں بھی یہہ بات نہ آئی تھی، کہ اس دُنیا میں کوئی آدمی، ایسی باتیں بھی کرسکتا ہے،

نئی منزل

کلکٹری کی ملازمت سے علیحدہ ہونیکے بعد، شمشاد گھر واپس نہیں گیا وہ اُسی جگہ ایک پبلک ادارے میں نوکر ہوگیا۔ شمشاد ابتدا ہی سے قومی کاموں میں دلچسپی لیتا تھا، تقریر اور مضمون نگاری کی بھی اچھی خاصی مشق تھی، اس لئے اس جدید منزل میں شمشاد کو کسی وقت کا سامنا نہیں ہوا۔ کلکٹری کے دفتر کے مقابلہ میں تنخواہ کم تھی [illegible] یہاں پر وہ پابندیاں اور ذمہ داریاں نہ تھیں، جن کے گوارا کر لینے کے بعد آدمی خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہے۔ پبلک ادارے کے سب لوگ اُس سے خوش تھے، اور وہ خود بھی اس زندگی سے مطمئن تھا۔

ضلع سے ایک ہفتہ وار اخبار نکلتا تھا، جس کے لئے اخبار کے کارپرداز، بڑے اصرار کیساتھ شمشاد سے مضامین لکھواتے تھے، شمشاد کی قومی نظمیں بھی اس اخبار میں شایع ہوتی تھیں۔ چند ہی روز کی مشق میں، شمشاد نگارش کے اسلوب سے واقف ہوگیا، اور اُس کے مضامین عام طور پر پسند کئے جانے لگے۔ عید سے کچھ دن پیشتر، اخبار کی طرف سے شاندار اعلان شائع ہوا کہ اس مرتبہ نہایت ہی شاندار عید نمبر شایع ہوگا۔ اخبار کے دفتر کی جانب سے متواتر تقاضے آنے پر شمشاد نے ایک مضمون اور ایک نظم عید نمبر کے لئے روانہ کردی۔ اخبار کا عید نمبر وقتِ مقررہ پر شایع ہوا، شمشاد کے پاس یہہ شمارہ قدرے دیر سے پہونچا، اُس نے رسالہ کو پڑھنا شروع کیا، تو سب سے پہلے صفحہ پر

ضلع کے ایک دولتمند شخص کی غزل مندرجہ ذیل نوٹ کیساتھ درج تھی :-

ہمارے پرچہ کی خوش قسمتی ہے، کہ اُس کو ہندوستان کے مایہ ناز شاعر کی قلمی معاونت حاصل ہو رہی ہے۔ ہمارے کرم فرما عالیجناب معلی القاب ادب نواز، ادب پرست حضرت ..... مدظلہ تغزل میں آج اپنا جواب نہیں رکھتے۔ جناب موصوف نے کبھی منظر عام پر آنے کی کوشش نہیں کی، یہہ غزل آپ سے بڑے اصرار کے بعد حاصل کی گئی ہے، پوری غزل کیف و مستی میں ڈوبی ہوئی ہے یقین ہے کہ آئندہ بھی جناب موصوف اپنے رشحاتِ عالیہ سے اس جریدہ کو رونق بخشیں گے۔

اس نوٹ اور غزل کو پڑھکر، شمشاد کے تن بدن میں آگ لگ گئی، وہ تو اپنے خیال میں صحافتی دُنیا کو آزاد اور خوددار سمجھتا تھا، لیکن اخبار کے نوٹ کو پڑھکر، اُسے معلوم ہوا کہ صحافتی دُنیا بھی اس لعنت سے آزاد نہیں ہے، غزل اسقدر ذلیل اور پست تھی کہ کسی معقول اور سنجیدہ اخبار میں درج ہونیکے قابل ہی نہ تھی۔ شمشاد اخبار کو لئے ہوئے، اخبار کے دفتر میں پہونچا اور ایڈیٹر صاحب کے کمرے میں دراتا ہوا چلا گیا۔

71

الی حالت کا مبالغ مل گیا ہے

آئیے! حضرت شمشاد! ابھی آپ کی بڑی عمر ہے۔ ابھی ابھی آپ کے مضمون اور نظم کی تعریف کر رہے تھے۔ ایڈیٹر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

میرے مضمون اور نظم کی آپ لوگ، تعریف کر رہے تھے، خوب! تو آپ لوگ زرپرست بھی ہیں اور منافق بھی

ہیں ——— شمشاد کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

بھئی شمشاد! آج آپ اتنی اکھڑی اکھڑی باتیں کیوں کر رہے ہیں، ہم منافق ہیں، زر پرست ہیں۔ اس سے آپ کا آخر مطلب کیا ہے، اور یہ باتیں بھی تو بالکل مہمل بے جوڑ سی ہیں ——— ایڈیٹر نے پنسل کو گھماتے ہوئے کہا۔

باتیں تو نہ مہمل ہیں اور نہ بے جوڑ، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، ٹھیک کہہ رہا ہوں ——— شمشاد نے انتہائی سنجیدگی کیساتھ جواب دیا۔

آپ نے ابھی فرمایا ہے کہ تم لوگ زر پرست اور منافق ہو، اس سے آپ کا مطلب کیا ہے، اور آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ——— ایڈیٹر نے شمشاد کیطرف بغور دیکھتے ہوئے بولا

آپ نے "عید نمبر" میں جس آب و تاب کیساتھ ان ..... صاحب کی غزل کو چھاپا ہے، اور جو لانبا چوڑا نوٹ تحریر فرمایا ہے، اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے اچھی غزل ان ہی صاحب کی ہے ——— شمشاد نے "عید نمبر" ایڈیٹر کے سامنے رکھتے

ہوئے کہا۔

اوہو! اتنی سی بات پر آپ تو بگڑ گئے، ارے بھئی! بڑے آدمیوں کی غزلیں اور مضمون اسی طرح شایع ہوا کرتے ہیں ——————— ایڈیٹر نے جواب دیا۔

تو آپ کے نزدیک، بڑے اور چھوٹے آدمی کا معیار صرف دولت ہے، جس کے پاس دولت نہ ہو وہ چھوٹا آدمی ہے، خواہ وہ کتنا ہی خود دار، صاحب کردار اور باکمال کیوں نہ ہو، اور مالدار آدمی خواہ کتنا ہی الو، گدھا اور ضمیم الاخلاق ہو، وہ آپ کی نگاہ میں بڑا آدمی ہے ——————— شمشاد ذرا تیز آواز سے بولا۔

بھئی آپ تو بالکل منطقی گفتگو کرنے لگے، کردار کی بلندی اور خود داری و کمال کی عظمت سے کس نامعقول کو انکار ہے، مگر جب اس دنیا میں رہنا ہے، تو ذرا دنیا داری سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔

جن صاحب کی غزل شایع ہوئی ہے، انہوں نے ہمارے "عید نمبر" کی دو سو کاپیوں کی پیشگی قیمت روانہ فرمادی ہے، اور آیندہ بھی حصول امداد کا وعدہ فرمایا ہے۔ ہم نے دو چار لفظ ان کی تعریف میں لکھ دئے، تو اس میں ایسا کونسا ہرج ہوگیا ——————— ایڈیٹر سر کھجاتے ہوئے بولا

ایڈیٹر صاحب: معاف فرمائیے، تو پھر آپ میں اور چکلہ میں بیٹھنے والی عورت میں مشکل ہی سے فرق ہوگا وہ بھی ذرا سی "دنیاداری" کے لئے بناؤ سنگھار کر کے، لوگوں کو گانا وانا سُنا کر و اپنا پیٹ پال لیتی ہے۔

قسم خدا کی ماتم کرنیکی جگہ ہے، کہ انہی اس غلطی کا آپ کو ذرا برابر احساس نہیں۔ آپ اخبار کے ایڈیٹر ہیں، اور آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم کے اخبار کے ایڈیٹر کا منصب کتنا بلند، اور اُس کی ذمہ داریاں کتنی مہتم بالشان اور اُس کے فرائض کس قدر اعلیٰ ہیں۔ اخبارات ہی ملک وقوم کی ذہنیتوں کی تعبیر کرتے ہیں، ان ہی اخباروں کے صفحات پر روزانہ ہماری زندگی کی تاریخ لکھی جاتی ہے۔ ہمارے جریدے، قوم و ملک کی عظمت کے نہ صرف نمایندے، بلکہ علمبردار ہیں، آپ نے اخبار کی اہمیت کو بالکل نہیں سمجھا اور آپ خود اپنے منصب اور فریضہ سے ناواقف ہیں، ایڈیٹر کا قلم ملک میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے، قوموں کی تقدیر بدل سکتا ہے۔ اخبارات ہی کی آواز پر وزارتیں بدل جاتی ہیں، اور حکومتوں کے دستور کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں ——— شمشاد نے غصہ کیساتھ جواب دیا۔

شمشاد صاحب! آپ کی انشاپردازی اور شاعری کا تو ہم کو اعتراف ہے، مگر معاف فرمائیے، دنیا کا آپ کو تجربہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ارے بھئی! جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، اُس سے زیادہ ہم جانتے ہیں، لیکن یہہ ہندوستان ہے، یورپ نہیں ہے، یہاں تو بڑے آدمیوں کی امداد کے بغیر اخبارات کا چلنا بہت مشکل ہے۔ آپ کی ابھی عمر ہی کیا ہے، زمانہ کے سرد و گرم اور دنیا والونکی ذہنیتوں اور اُن کے حالات سے آپ واقف کہاں ہیں؟ آپ کو جب دنیا سے سابقہ پڑیگا، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں صرف خیالی منطقوں اور ذہنی فلسفہ سے کام نہیں چلتا۔ پیسہ بڑی مشکل اور ترکیب سے حاصل ہوتا ہے ——————— ایڈیٹر نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔

تو آپ نے صرف پیسہ حاصل کرنے کے لئے اخبار نکالا ہے، آپ کے اخبار کی پالیسی "حصول زر" ہے، تو یہہ تو بڑا خوفناک دہوکا اور کھلی ہوئی منافقت ہے آپ کے اخبار پر تو لکھا ہوا ہے:-

"قوم و ملک کا ترجمان سچا خادم"

اور آپ اپنے مقالوں میں اکثر و بیشتر لکھتے رہتے ہیں

کہ ہماری پالیسی بالکل آزاد ہے، ہمارا شیوہ حق گوئی اور بیباکی ہے، لیکن آج معلوم ہوا کہ وہ سب فریب اور بناوٹ ہے، ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور، کھانے کے اور ہوتے ہیں ــــــــــــ شمشاد نے جواب دیا۔

وہی منطقیانہ جوابات، فلسفیانہ گفتگو ۔ ! بھائی! آپ تو بال کی کھال نکالتے ہیں، آپ سے تو بڑی احتیاط کیساتھ گفتگو کرنے کی ضرورت ہے، یہ کس مردود نے کہا ہے کہ ہماری پالیسی "حصول زر" ہے مگر روپیہ، پیسہ سے ہم بے نیاز تو نہیں ہیں۔

صرف خریداروں کے چندے سے تو اخبار نہیں چل سکتا، امیر، اُمرا، اعانت نہ کریں، تو آج ہی اخبار بند ہو جائے، امیروں کے سامنے بھی کچھ نہ کچھ جھکنا پڑتا ہے، اور ضلع کے حاکموں کے پاس بھی سمنوں اور اشتہاروں کے لئے جانا پڑتا ہے ــــــــــــ ایڈیٹر سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

ایڈیٹر صاحب ! ایسا اخبار، جو امیروں کی اعانت اور عدالتی اشتہارات پر چلتا ہو، اس کو یقیناً بند ہو جانا چاہیئے، اس کی پالیسی کبھی آزاد نہیں ہو سکتی، اس اخبار سے تو ملک اور قوم کو فائدہ پہنچنے کے بجائے اُلٹا نقصان

پہنچتا ہے،

پھر آپ میں اور اُس شخص میں جو چوراہے پر کھڑا

ہوکر "سانڈے کا تیل" بیچتا ہے" آخر کیا فرق ہے۔

شمشاد ابھی اپنی بات پوری کہنے بھی نہ پایا تھا، کہ اخبار کے ایڈیٹر نے جھینپ کر

آواز دی:-

ارے لڑکے! شبّو کے یہاں سے برف کی قلفیاں

تو لانا۔

شمشاد نے جانیکی اجازت چاہی، ایڈیٹر نے روکا کہ آپ کے لئے برف کی قلفیاں

منگائی ہیں، شمشاد بڑا ملنسار اور خلیق تھا، مگر آج کی بات چیت نے اسکی طبیعت

کو مکدر بنا دیا تھا۔ اور وہ ایڈیٹر سے ظاہری اخلاق برتنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اِس لئے

وہ وہاں سے بہت جلد چلا گیا۔

ایڈیٹر صاحب کے کمرے سے بالکل قریب، اخبار کے مینیجر صاحب کا کمرہ تھا

جن کو سب لوگ "منشی صاحب" کہہ کر پکارتے تھے۔ اُن منشی صاحب کی عمر ساٹھ

سے کچھ اوپر ہی ہوگی، لیکن یہہ کوئی پندرہ سال سے اپنی عمر پچاس سال کی ہی بتاتے

چلے آرہے تھے۔ خضاب آلود ڈاڑھی، سرمگیں آنکھیں، حیدرآبادی اچکن، اور

پائجامہ، غرض ہمارے منشی صاحب ہر وقت بنے ٹھنے رہتے تھے اور اپنی مردانگی

اور آوارگی کے قصے سُناتے رہتے تھے۔ منشی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اُنکی شکل

شاہ نصیر الدین حیدر شاہِ لکھنؤ سے ملتی ہوئی ہے۔

ایڈیٹر نے ان ہی منشی صاحب کو آواز دیکر بلایا، منشی صاحب پان چباتے

ہوئے، تشریف لائے۔

منشی صاحب! آپ نے شمشاد صاحب کی باتیں سنیں . . . . اور

ایڈیٹر، ابھی کچھ کہہ ہی رہا تھا کہ منشی صاحب، ایڈیٹر کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔

بالکل درست دماغ خراب ہوگیا ہے، اس لونڈے کا! دو ایک مضمون اور

غزلیں، اخبار میں کیا چھپیں کہ اپنے کو افلاطون کا سالا سمجھنے لگا۔

ایڈیٹر صاحب! قسم کلام مجید کی، خون کے گھونٹ پی کر، اس کی باتیں

سنی ہیں، آپ کا منہ تھا، جو ضبط کر گیا، ورنہ اس کی جوانی کا سارا زور

ڈھیلا کر دیتا۔

امیروں کی غزلیں مت چھاپو، ان کی تعریف مت کرو، قوم و

ملک کی خدمت کرو، اخبار کی پالیسی کو آزاد رکھو، مطلب یہہ ہے کہ

بھوکے مرجاؤ، بیوی بچوں کو سنکھیا دے کر سلادو۔ "قوم، قوم، خدمتِ

وطن" یہہ آجکل کے لونڈے، بے دین ہو گئے ہیں۔ جو منہ میں آتا ہے بک

دیتے ہیں —

ادہر منشی جی نے اگالدان پیک تھوکنے کے لئے اٹھایا، ادہر چپراسی نے ان ہی صاحب

کا خط جن کی غزل بڑی آب و تاب کیساتھ شایع ہوئی تھی، ایڈیٹر کو لاکر دیا۔ اس خط میں

نواب صاحب نے ایڈیٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا تھا، اور پہلی تاریخ کو ایک سو روپیہ دینے

کا وعدہ تھا۔

منشی جی! دیکھئے ہمارے نواب صاحب نے ایکسو

روپیہ اور دینے کا وعدہ فرمایا ہے، یہہ شخص کتنا دریا دل ہے۔ ایڈیٹر، خط منشی جی

کو دیتے ہوئے بولا۔

ایڈیٹر صاحب! دیکھتے جائیے، ایسے کتنے سو، آپ کو وصول ہوں گے، اب کی دفعہ انکی ذرا تصویر تو شایع کر دیجئے ــ اور ہاں! کل میں جے گڑھ کے حاکم پرگنہ کے پاس گیا تھا، آپ نے جو اُن کی تعریف میں چند جملے لکھے ہیں، اُن کو پڑھکر وہ خوش ہو رہے تھے، اور کہتے تھے کہ میں نے سرکاری طور پر، اس اخبار کے خریدے جانے کی تحریک کی ہے یہہ اخبار بڑی بے لاگ تنقید کرتا ہے ــ اور ایڈیٹر صاحب! خدا کے لئے پیشکار صاحب کے لڑکے کی شادی کا سہرا اب کی دفعہ ضرور اخبار میں چھاپ دیجئے، کئی سمن اور اشتہار ہمارے اخبار کو مل جائیں گے۔

اور ہاں! ایک بڑی ضروری بات تو بھول ہی گیا۔ یہہ جو ہمارے محلہ کے لونڈوں نے، فلسطین، فلسطین کہہ کر او دھم مچا رکھا ہے، اور اُسی سلسلہ میں جو جلسہ ہونیوالا ہے، اُس جلسہ کی کارروائی کو آپ ذرا بگاڑ کر لکھہ دیجئے، پھر دیکھئے! کہ خدا غیب سے کیا صورت پیدا کرتا ہے

غرض منشی صاحب بہت دیر تک وعظ فرماتے رہے، اور ایڈیٹر صاحب ایک نیک بخت فرزند کی طرح خاموشی کیساتھ سُنتے رہے، اس انداز کیساتھ کہ ہم مُنہ سے کچھ نہیں کہتے ہیں، لیکن تمھاری ایک ایک بات سے مجھے اتفاق ہے۔ اور وقت پر سب کچھ کر دیا جائیگا۔

جس ادارے میں شمشاد ملازم تھا، اُس کا سالانہ جلسہ ہونیوالا تھا، اُس جلسہ کی صدارت کے لئے بھی شہر کے ایک خان بہادر صاحب کا نام ارکان نے تجویز کیا شمشاد

نے اس کی مخالفت کی کہ ہمارے ادارے کے ارکان میں ایسے لوگ موجود ہیں، جو جلسہ کی صدارت کے لئے موزوں ہیں، جن کی خدمات بہت زیادہ گرانقدر اور پُرخلوص ہیں۔ لیکن شمشاد کی بات کو کسی نے نہ سُنا، اور وہ اس لئے کہ جلسہ کے تمام مصارف خان بہادر صاحب نے اپنے ذمہ لے لئے تھے، ایسی صورت میں اُن کو صدر بنانا ضروری تھا، کیونکہ صدر بننے کی قومی خدمت کی خواہش ہی نے تو اُن کو اس سخاوت پر آمادہ کیا تھا، اور اسی تمنا نے تو اُن کے دریائے کرم کو متموج بنایا تھا۔ جلسہ ہوا اور بڑے دھوم دھام کا جلسہ ہوا صدر صاحب نے اپنا خطبہ، جو ایک دوسرے صاحب نے لکھ دیا تھا، اس طرح تن تن کر پڑھا، جیسے کہ اس کا ایک ایک لفظ ان ہی کی تراوشِ فکر کا رہینِ منت ہے۔ تمام مقررین نے، صدر صاحب کی تعریف میں زمین، آسمان کے قلابے ملا دئے، دنیا میں جتنی خوبیاں ہو سکتی تھیں، اُن سب کا مظہر صدر صاحب کو بتایا گیا شمشاد نے، لہو کے گھونٹ پی کر، اس ڈرامہ کو دیکھا۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد، وہ سیدھا دفتر کے ادارے میں آیا۔ اور اپنا استعفا پیش کر دیا۔

شمشاد کے کام سے سب لوگ خوش تھے۔ اُس کی مستعدی، اور اُس کے خلوص نے سب لوگوں کو مسخر کر لیا تھا، اس لئے اُس کے استعفے پر لوگ اُس کو سمجھانے لگے، مگر شمشاد ان طفل تسلیوں میں آنے والا نہ تھا، وہ ادارے سے علیحدگی کا ارادہ کر چکا تھا، اب کوئی طاقت اُس کے ارادے کا رُخ نہیں بدل سکتی تھی۔ ادارے سے علیحدگی کے بعد، وہ دو تین دن شہر میں رہا اور سوچتا رہا کہ اُسے کہاں جانا چاہیئے؟ اور کیا کرنا چاہیئے؟ بہت سوچ، بچار کے بعد اُس نے یہی فیصلہ کیا کہ اُسے قیصر پور جا کر، کچھ کرنا چاہیئے شہروں کی تہذیب زدہ دُنیا اور

جاہ پرست اور ریاکار ماحول میں تو رہ ہی نہیں سکتا اور وہاں کی آب و ہوا اُس کی خودداری کو راس آہی نہیں سکتی۔

خیال کی اصلاح

ادارہ شمشاد نے قیصر پور پہنچ کر، اس بات کا پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ کہیں باہر جا کر روزگار کی تلاش نہ کریگا، اس "امارت زدہ" دُنیا سے وہ تنگ آچکا تھا، اور شہروں کی زندگی میں اُس کے لئے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ قیصر پور کے باشندے، بہت ہی سیدھے سادے اور تہذیب جدید کی اصطلاح میں "غیر مہذب" تھے، شمشاد ان ہی لوگوں میں ہنسی خوشی کیساتھ رہنے لگا۔ تہذیب و سیاست کی دُنیا میں جو منافقت اور ریاکاری پائی جاتی ہے، قیصر پور میں اُس کی پرچھائیں بھی نظر نہ آتی تھی، یہاں نہ تو افسروں اور حاکموں کا تجبر کارفرما تھا، اور نہ امیروں اور دولتمندوں کا طمطراق نظر آتا تھا، سب لوگ مل جُل کر عزت کی زندگی بسر کر رہے تھے، کوئی شخص کسی سے دوست اور جاہ و منصب کی بناء پر جُھک کر نہیں ملتا تھا۔

شمشاد، قیصر پور کی سوسائٹی میں بہت جلد گھل مل گیا، اور سب لوگ اُس سے انتہائی محبت اور خلوص کا برتاؤ کرنے لگے، کوئی شک نہیں کہ قیصر پور کے باشندوں کا شعور، تہذیب و امارت کے اُس اثر سے پاک تھا، جو انسان کو خود اپنی نظر میں ذلیل بنا دیتا ہے، لیکن پھر بھی غیر محسوس طور پر، اس تصور کے

دھندلے نقوش وہاں بھی پائے جاتے تھے اور قیصر پور کے باشندوں کی صحبتوں میں بھی مالداروں
دولتمندوں، امیروں اور حاکموں کے تذکرے عجیب عجیب انداز میں کئے جاتے تھے،
شمشاد نے، قیصر پور میں اپنے کانوں سے سنا۔

فیروز پور کے راجہ بڑے ہی سخی اور فیاض تھے، ایک دفعہ انکے
دربار میں گوالیار کی ایک طوائف حاضر ہوئی، راجہ جی نے کہا کہ اچھا!
گانا سناؤ، طوائف نے اتنا اچھا گانا گایا کہ تمام درباری لوگ جھومنے
لگے، راجہ جی نے خوش ہو کر، اپنے گلے سے سچے موتیوں کا مالا اتار کر دیدی،
یہہ طوائف بھی بڑی حرفوں کی بنی ہوئی تھی، جب راجہ جی نے اس کو
سچے موتیوں کی مالا دی ہے، تو اس نے جھک کر سلام کیا، اور اس
انداز کیساتھ ناچتی ہوئی واپس ہوئی کہ محفل میں سماں بندھ گیا، راجہ جی
نے اس پر خوش ہو کر، اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر پھینکدی ۔ سچے موتیوں
کی مالا اور انگوٹھی، دونوں کی قیمت پچاس ہزار سے کچھ زیادہ تھی، غرض
راجہ جی نے اس طوائف کی سات پشتوں کو نہال کر دیا۔

بڑے گاؤں کے نواب رونق علی، اپنے وقت کے راجہ اندر
اور واجد علیشاہ تھے، ان کے دربار کے دیکھنے والے لوگ بیان کرتے تھے،
کہ ایسی شاندار محفل دیکھی نہ سنی! نواب صاحب نے اپنے آدمیوں کو
ایران بھیج کر، اپنے خاص کمرے کے ناپ کا قالین منگایا تھا، قالین کیا
تھا پھول باغ تھا، بیل بوٹے، روشیں سبزہ سب کچھ اس قالین میں
موجود تھا غرض بنانیوالے نے ایسی کاریگری دکھائی تھی کہ بس اس

قالین کو گھنٹوں دیکھتے ہی رہے پھر نرمی کا یہ حال کہ چلتے میں پیر ایک ایک بالشت قالین میں دھنس جاتے تھے، اسی محل میں چار فانوس تھے، رات کو جب وہ فانوس روشن ہوتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہتابیاں چھٹ رہی ہیں، اسی قالین پر، ان ہی رنگین فانوسوں کی روشنی میں خوبصورت چھوکریاں، پھولوں کی چنگیریں اور شراب کی بوتلیں ہاتھوں میں لیکر ناچتی تھیں ۔ ان چھوکریوں کو اتنا مہین لباس پہنایا جاتا تھا کہ نگاہیں نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچ جاتی تھیں ۔ نواب صاحب جب اشارہ فرماتے، تو چوبدار سونے، چاندی کے پھول ناچنے والوں پر نچھاور کرتے ۔

اور ہاں ! یہ نواب صاحب حقہ تو اس شان اور اہتمام کیساتھ پیتے تھے کہ اسکی مثال ملنی دشوار ہے ۔ چاندی کی چلمین اور سبک فرشی، جس پر میناکاری کا کام، جھل مل کرتا تھا، حقہ کا نیچہ سونیکے تاروں کا بنا ہوا، کمخواب اور تاش بادلے کے پر، سونے کے تار کیا بھلے معلوم ہوتے تھے، اسپر سونے کی بھاری زنجیر، جس میں کبوتر کے انڈے کے برابر ہیرا لگا ہوا تھا، حقہ کی نے میں بندھی رہتی تھی، نواب صاحب کے جن کھیتوں میں تمباکو کی کاشت ہوتی تھی، ان کھیتوں کے لئے میں گورکھپور سے مٹی منگوا کر ڈالی جاتی تھی ۔ نواب صاحب کیلئے تمباکو اور خمیرہ بڑے اہتمام کیساتھ تیار ہوتا تھا ۔ پچاس پچاس روپیہ ماہوار کے چار آدمی صرف تمباکو بنانے کے لئے نوکر رکھے گئے تھے، خمیرے میں

ڈیڑھ تولہ فی سیر کے حساب سے عنبر ڈالا جاتا تھا، نواب صاحب، جب حُقّہ پیتے تھے، تو ایک ایک میل تک عنبری خمیرے کی خوشبو کی لپٹیں جاتی تھیں۔

اجی ـــــ ! جن نواب صاحب کا آپ ذکر کر رہے ہیں، اُن کے بڑے چچا، جن کو چھوٹے نواب کہتے تھے، عجیب و غریب آدمی تھے۔ گرمیوں میں ڈھاکا پاٹن کی مہین ململ کا کرتا پہنتے تھے، چوڑے پائینچہ کا پائجامہ سفید ٹوپی، بھئی! یہہ لباس اُن کے جسم پر کیا کھلتا تھا دن میں دو وقت جوڑا بدلتے تھے، میں نے ایک دفعہ اُن کے یہاں کھانا کھایا تھا، آج تک زبان اس کے مزے لے رہی ہے۔ اُن کے یہاں کے کھانوں کی کیا تفصیل بیان کروں، خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی پانچ طرح کا تو پلاؤ تھا، انناس کا پلاؤ میں نے پہلی مرتبہ اُن ہی کے یہاں کھایا تھا، قورمہ میں بادام پڑے ہوئے، ہرن کے کباب، بھُنی ہوئی بٹیریں، پستہ کا ہریرہ، لوز، زردہ، موتیا، اور صاحب! فیرینی تو اس مزے کی تھی کہ اب بھی اُس کے تصور سے مُنہ میں پانی بھر آتا ہے، ان ہی نواب صاحب کے یہاں کے لوگ کہتے تھے کہ ان کے یہاں ڈھائی سو روپیہ روز کا، دسترخوان کا خرچ ہے۔

ہمارے والد جن قاضی صاحب کے یہاں ملازم تھے، اُنکی آمدنی ایک لاکھ روپیہ سال سے کچھ اوپر ہی تھی۔ قاضی صاحب جاڑوں کے زمانہ میں برف پیتے تھے، کہتے ہیں کہ کسی حکیم نے اُن کو بہت

ہی گرم کشتہ کھلا دیا تھا، قاضی صاحب کے چار بیویاں تھیں، اور پندرہ بیس طوائفیں نوکر تھیں، ایک طوائف، متھرا کے کسی سیٹھ کے یہاں ملازم تھی، قاضی صاحب نے آگرہ میں کسی محفل میں اسے دیکھ لیا، اور اُن کی طبیعت اُس پر آگئی، قاضی صاحب نے گھبرا کر اپنے مصاحبوں سے کہا کہ اس طوائف کو جیسے بھی بنے، لیکر آؤ، مصاحبوں نے کہا کہ سرکار! متھرا کا ایک بنیا، اُس کو پانچ سو ماہوار دیتا ہے، اور ہم نے سُنا ہے کہ اُس طوائف کے لئے اس سیٹھ نے بیس ہزار روپیہ لگا کر، ایک حویلی تیار کرادی ہے اور وہ اُس پر بُری طرح ریجھا ہوا ہے، قاضی صاحب نے فرمایا کہ میں ایک لاکھ روپیہ تک اُس پر خرچ کر سکتا ہوں، وہ دو ہوتی بند بنیا بھلا کہیں ہمارا مقابلہ کر سکتا ہے، وہ پانسو دیتا ہے، ہم ایک ہزار روپیہ ماہوار دیں گے۔ تو بھائیو! آپ جانتے ہیں کہ روپیہ کے زور سے کیا کچھ نہیں ہو سکتا، پیسہ کی کرامات کا کیا پوچھنا! قاضی صاحب کے مصاحبوں نے ایک ہفتہ کے اندر اُس طوائف کو قاضی صاحب کے یہاں لاکر پیش کر دیا۔ قاضی صاحب کو ایک لاکھ روپیہ کے قریب روپیہ خرچ کرنا پڑا، مگر صاحب! عورت بھی قیامت کی تھی، اُس کی نزاکت کا کیا پوچھنا، بالکل چھوٹی موٹی اور دھان پان تھی، پان کی پیک، اُس کے گلے کی رگوں میں سے صاف نظر آتی تھی۔

علی گنج میں ایک زمیندار ہیں، اُن کے لڑکے کی ابھی حال میں مسلمانیاں ہوئی تھیں، اُس تقریب میں انہوں نے اتنا زنا دتی

کیساتھ کھانا پکوایا تھا، کہ زردے اور بریانی کی بیسیوں دیگیں تو زمین
میں دفن کر دینا پڑیں ۔ ان ہی صاحب کے یہاں مشکی گھوڑوں کی جوڑی
ہے، بس گھوڑے کیا ہیں، مورتیں ۔ ان گھوڑوں کا ناشتہ دودھ
اور جلیبیوں سے ہوتا ہے، کلابتوں کی قیمتی ڈوریاں ان گھوڑوں کی
گردنوں میں بندھی، ان ہی صاحب کے بڑے بھائی کو کتے پالنے
کا شوق ہے، کئی سو روپیہ مہینہ کتوں کی غور و پرداخت پر خرچ
ہوتا ہے، ایک کتا اُنہوں نے کسی فوجی انگریز سے دو ہزار روپیہ
میں مول لیا ہے، اب اُن کو اُسی میل کی کُتیا کی تلاش ہے، اور وہ
اس کے لئے پانچ ہزار روپیہ تک خرچ کرنے کے لئے تیار ہیں ۔

ہمارے ضلع میں ایک انگریز کلکٹر آیا تھا، جسے شکار کا
بہت شوق تھا، ایک ایک دن میں سو سو مُرغیاں اور قازیں
اُس نے شکار کی ہیں، اتنا بڑا آدمی ہو کر، شکار کی تلاش میں
تین تین میل پیدل چلتا تھا، یہہ انگریز بڑے اخلاق کا آدمی تھا،
ضلع میں کانگریس کے لوگ ستیاگرہ کر رہے تھے، لوگوں میں جوش
پھیلا ہوا تھا، ~~میرے نانا کا ضلع کے لوگوں پر بڑا اثر تھا، کلکٹر صاحب~~ جب
~~نے اُن کو مشورہ کرنے کے لئے بلایا~~ ۔ میرے نانا کا ضلع کے لوگوں پر
بڑا اثر تھا، کلکٹر صاحب نے اُن کو مشورہ کرنے کے لئے بُلایا، میرے
نانا جب صاحب کی کوٹھی پر پہونچے ہیں تو وہ سیڑھیوں تک اُنکے
لئے آیا، اور اپنے ہاتھ سے دیا سلائی جلا کر، ہمارے نانا کی سگرٹ

سلگائی۔

یہہ جو اشنان گڑھ کے خان بہادر صاحب ہیں انکی خوراک اتنی کم ہے، کہ دوسرا آدمی اتنا کم کھائے، تو کل مرتا ہو تو آج مرجائے، صبح کو دو چوزوں کا شوربہ پیتے ہیں، اور دوپہر کو بہت ہی ہلکی دو چپاتیاں کھاتے ہیں، اُس کے بعد تیسرے پہر کو سیب کے مُربے کی دو قاشیں چاندی کے ورق کیساتھ، اور شب میں گیہوں کا میٹھا دلیا، اور تھوڑا سا دودھ!

صاحب! یہہ ہمارے ضلع کے نواب زادہ صاحب بڑے ہی مذہبی اور مسلمان آدمی ہیں۔ اب کے اجمیر شریف کے عرس میں گئے تو دو ہزار روپیہ کی لاگت کی چادر بنوا کر لے گئے، بہترین قسم کی مخمل پر سچا کام ہوا تھا، جب انگریزی باجے کیساتھ، یہہ چادر اجمیر شریف کی گلیوں سے نکلی ہے، تو سب لوگ تعریف کرتے تھے۔

اور صاحب! نواب زادہ صاحب درویشوں، فقیروں اور مجذوبوں کے تو عاشق ہیں، ذرا کسی نے کہہ دیا، کہ فلاں جگہ مجذوب رہتے ہیں، بس آپ پھر وہاں جو اُن کو دن میں دس بیس مرتبہ بیٹھا دیکھیں گے۔

کلیم گنج کی بڑی مسجد کے پاس جو خانقاہ ہے، وہاں ایک مجذوب رہتے ہیں، میں نے اُن مجذوب صاحب کی زیارت کی ہے، دن رات چرس اور بھنگ پیتے ہیں، ان کی داڑھی

دھوئیں سے لال ہوگئی ہے، مگر صاحب! کیسے بافیض بزرگ ہیں
جو زبان سے کہہ دیتے ہیں، پورا ہو کر رہتا ہے، نواب زادہ صاحب،
تو اُنکے اتنے معتقد ہیں کہ مہینوں کلیم گنج میں آکر رہتے ہیں، مجذوب
صاحب ان کو گالیاں دیتے ہیں، مگر نواب زادہ صاحب ہنس ہنس کر
اُن کے پیر دباتے ہیں۔ مجذوب صاحب کے نشہ پانی کا سارا خرچ
نواب زادہ صاحب ہی کے ذمہ ہے۔

شمشاد نے ان لوگوں کی باتوں سے محسوس کیا، کہ یہہ لوگ بھی خیالی طور پر
اُسی لعنت میں گرفتار ہیں، جس لعنت سے وہ پیچھا چھڑا کر، یہاں آیا ہے شمشاد
نے انتہائی نرمی اور خوش کلامی کیساتھ، اُن لوگوں کے خیالات کی اصلاح کی ——
پہلے پہل تو لوگ ذرا چونکے، اور اعتراضات کرنے لگے، —— لیکن شمشاد
نے اس قدر معقول اور نفسیاتی انداز میں، جوابات دئے۔ کہ سب لوگ مان گئے، اور
شمشاد کی باتیں اُن کے دلوں میں گھر کر گئیں۔

شمشاد نے قیصر پور کے لوگوں کو بتایا کہ دُنیا نے "بڑائی" کا معیار مقرر
کرنے میں بڑی غلطی کی ہے، "بڑائی" روپیہ پیسہ، جائداد اور عہدے کا نام نہیں
ہے، بڑا اور عزت والا وہ ہے، جو کیریکٹر رکھتا ہے، کسی کمال کا حامل ہے" اور اپنے
بھائیوں کیساتھ بھلائی، ہمدردی اور عزت کیساتھ پیش آتا ہے۔ بہت سے چور
ڈاکو اور جواری، آپ کو ملیں گے، جو بہترین کھانا کھاتے، اچھے سے اچھا کپڑا پہنتے اور
بڑے عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں، تو کیا صرف عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے
سبب، اُن کو "بڑا آدمی" کہا جائے گا۔ طوائفوں کے مکانوں کو جاکر دیکھو، تو تم کو

قیمتی قالینوں، چاندی کے اگالدانوں، دُودھ سے زیادہ سفید چاندنی، جھاڑ فانوس اور اسی قسم کے اسباب آرائش کی ایک نمائش نظر آئے گی۔ تم طوائفوں کے قیمتی لباس کو دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے، اُن کی کلائیوں میں سینکڑوں روپیہ کے کنگن اور اُن کی گردنوں میں ہزاروں کے ہار پڑے ہوں گے، تو کیا اس آرائش اور عیش و عشرت کی زندگی کے سبب تم اُن کو "بڑا آدمی" کہہ دو گے؟ انسانیت کی نگاہ میں وہ باعصمت عورت جس کے بدن پر ایک چاندی کا تار بھی نہیں ہے، جس کے کپڑوں میں بیشمار پیوند لگے ہوئے ہیں، جس کے اُلجھے ہوئے بالوں کو مُدت سے تیل کی ایک بوند بھی نصیب نہیں ہوئی، ان آبرو باختہ طوائفوں کے مقابلہ میں زیادہ مُعزز اور محترم ہے۔

اچھے کھانے کھانا، بہترین لباس پہننا، عالیشان محلوں میں رہنا، طوائفوں کے گانے سننا، کوئی کمال کی بات نہیں ہے، اور ان چیزوں کا انسانیت کی بڑائی سے ذرہ برابر کوئی تعلق نہیں ہے، آپ ایک چمار اور بھنگی کو دولت دید یجئے وہ ان لوگوں سے جن کو آپ "بڑا آدمی" کہتے ہیں، زیادہ عیش کر کے، اور بہت زیادہ اہتمام اور طمطراق کیساتھ رہ کر دکھا دیگا، طوائفوں کو ہزاروں کی مالائیں اور انگوٹھیاں دیدینا کوئی کمال نہیں ہے، سخاوت نہیں ہے، سیر چشمی نہیں ہے۔ اور مشکی گھوڑوں اور کُتوں کو دودھ اور جلیبیاں کھلانے سے بھی کوئی انسان بڑا آدمی نہیں بن جاتا۔

وہ نواب جو ہزاروں روپیہ صرف پینے کے تمباکو اور خمیرے پر خرچ کر دیتا ہے پرلے درجہ کا احمق اور فضول خرچ ہے، ایسا نفس پرست انسان جو دولت کو دھوئیں کی طرح اُڑا دیتا ہے، دُنیا کے کس کام کا! وہ کسی کے دُکھ درد سے کیا واقف ہو سکتا ہے، اُسے کیا خبر کہ چند پیسوں کے لئے خدا کا ایک بندہ دھوپ میں کھڑے ہو کر پھاوڑا چلاتا ہے۔

دس قسم کے پلاؤ۔ بیس قسم کے مُربے، پچاس قسم کی چٹنیاں کھانیسے آدمی بڑا نہیں ہوجاتا۔ بہت سے جنگلی جانور بہترین قسم کے پھل کھاتے ہیں۔ ایسے پھل، جو امیروں کو بھی میسر نہیں، دیکھتے نہیں ہو کہ تتلیوں اور قمریوں کے پر کتنے رنگین اور جاذب نظر ہیں، بھونرے کیسی نرم و نازک پتیوں اور کونپلوں پر بیٹھ کر تانین اُڑاتے ہیں تو اس منزل میں آپ کے یہہ "بڑے آدمی" جانوروں اور چڑیوں سے شائد کچھ پیچھے ہی ہیں۔

جن صاحب نے اپنے "فرزند ارجمند" کی ختنہ کی تقریب میں، اتنا بہت سا کھانا پکوایا تھا، کہ کھانے کو زمین میں دفن کرنیکی نوبت آئی، تو انہوں نے انتہائی حماقت اور بے ڈھنگے پن کا ثبوت دیا۔ یہہ سیر چشمی اور فیاضی نہیں "حماقت" اور "چغدیت" ہے۔

کلکٹر صاحب اگر شکار کے شوق میں تین تین میل پیدل چلتے تھے، تو اُس میں کیا کمال ہوا، تم میں سے بہت سے لوگ روزانہ دس دس بارہ بارہ میل پیدل چلتے ہیں، اب رہی کلکٹر صاحب کی خوش اخلاقی، تو وہ تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے، جب وقت پڑتا ہے تو آدمی گدھے کو بھی باپ بنالیتا ہے، کلکٹر صاحب نے دیکھا کہ رعایا فرنٹ اور برگشتہ ہورہی ہے، ایک بارسوخ آدمی کی ضرورت ہے کہ وہ اس شورش کو اپنے اثر سے دبا سکے، بس اسی مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اُس نے آپ کے نانا کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا۔ اس کو اخلاق اور انسانیت سے کیا واسطہ! یہہ تو منافقت اور ریا کاری ہوئی۔!

آپ کے وہ خان بہادر صاحب جو بہت کم کھانا کھاتے ہیں تو وہ یقیناً معدہ کے مریض ہونگے، اگر یہہ بات نہ ہوتی تو وہ بریانی کی قابیں کی قابیں کھاکر بھی ڈکار نہ

لیتے اُن کی یہہ کم خوری اس لئے نہیں ہے کہ وہ اپنی خوراک میں سے کچھ حصہ غریبوں کو دے دیتے ہیں، بلکہ صرف صحت کی خرابی کی وجہ سے وہ معذور ہیں، اُن کی خوراک سے ہٹ کر دیکھیئے کہ وہ عیش وعشرت کی کس مد میں کمی کرتے ہیں۔ اور پھر اُن کی خوراک کی جو تفصیل آپ نے پیش کی ہے، وہ کچھ کم تو نہیں ہے، دو چوزوں کا شوربہ، جو شخص صرف ناشتہ میں ڈکار جاتا ہو، اس کو کم خوراک کہتے ہیں۔ تعریف کے قابل تو وہ لوگ ہیں، جو ایک وقت روکھی سوکھی کھا کر، مٹی کھودتے ہیں۔ سجی ہوئی نرم وگداز مسہریوں پر لیٹنے والے، اگر چوزوں کا شوربہ پی کر، اور سیب کا مُربہ کھا کر، مزے اڑاتے ہیں، تو اس میں تعریف کی کیا بات ہے۔

جن نواب زادے صاحب کو آپ نے مذہبی اور بڑا خدمت پرست بتایا ہے میرا بس چلے تو اُن کی خدا پرستی اور مذہبیت کے تمام جوڑ ڈھیلے کر دوں۔ بھائیو! ذرا عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے، مذہبیت تو اُس چیز کا نام ہے۔ جس کے لئے خدا اور رسولؐ نے حکم دیا ہو، اگر کوئی چیز خدا اور رسولؐ کے احکام کے خلاف ہے، اُس پر عمل کرنیوالے کو "مذہبی" کہنا، دوسرے لفظوں میں مذہب کا مذاق اڑانا ہے انگریزی باجہ کیساتھ زری کے کام کی جگمگاتی ہوئی چادر کی نمائش کرنا کیا قرآن وحدیث سے ثابت ہے! اسلام نے نمود و نمایش کی سخت مذمت کی ہے، دو ہزار روپیہ جو اُن نواب زادہ صاحب نے چادر کے بنوانے میں صرف کئے ہیں، کاش! اس کے آدھے روپئے، غربا اور مساکین پر خرچ کئے جاتے۔

اب رہا مجذوبوں اور درویشوں کی عقیدت کا معاملہ، سو اس کی حقیقت صرف اتنی ہے، کہ یہہ دولتمند اور امیر، جن کے گناہوں اور سیاہ کاریوں کی کوئی حد

نہیں ہوتی، اپنی نجات کے لئے سہل سے ذرایع اور حیلے تلاش کرتے رہتے ہیں، تلافیٔ مافات کی ان میں طاقت نہیں ہوتی، اور جس عیش کی زندگی کے یہہ عادی ہوجاتے ہیں، اور جو سیاہ اعمال وافعال، ان کے کردار کا جز بن جاتے ہیں، اُن کو یہہ چھوڑ نہیں سکتے، تو اب یہہ لوگ اسی تلاش اور جستجو میں رہتے ہیں، کہ کوئی مجذوب یا فقیر، ان پر کچھ پڑھ کر پھونک دے تاکہ ان کا "معصیت زدہ" بدن جہنم کے شعلوں سے محفوظ رہ سکے۔ یا کوئی ایسی دُعا یا ایسا وظیفہ ہاتھ لگ جائے، کہ ادھر دو بول منہ سے نکلے، اور "مقصود" سامنے موجود ــــ! تم دیکھوگے کہ اس قسم کے مجذوبوں، فقیروں اور درویشوں کے سب سے زیادہ معتقد، یہی آپ کے راجہ اور امیر، اور طوائفین ہوتی ہیں۔ طوائف کے یہاں کوئی شخص دُھلے ہوئے کپڑے پہن کر پہنچ جائے، اُسکی بیحد خاطر و مدارات کی جائیگی وہ طوائف جو بڑے سے بڑے امیر کو بھی خاطر میں نہیں لاتی، فقیروں کو دیکھ کر زمین پر بچھ جائیگی۔ آپ نے جس "مجذوب دوستی" اور "درویش پرستی" کا نام "مذہبیت" رکھا ہے۔ اُس منزل میں طوائفین، آپ کے ان اجاؤں اور امیروں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔

بزرگوں کے مزاروں پر بھی یہہ طوائفین اس قدر عقیدت کیساتھ، نظریں جھکائے ہوئے اور ساڑی کے پلّو سے سر چھپائے ہوئے حاضر ہوتی ہیں، جیسے یہہ بیچاری بڑی ہی اللہ والی ہیں، اور صاحب مزار سے ان کو سچ مچ بڑی عقیدت ہے، یہی حال آپ کے اُن امیروں کا ہے، جن کی تعریف کرتے کرتے آپ کی زبان خشک ہوئی جاتی ہے۔

شمشاد کی باتوں کا قیصر پور کے لوگوں پر بہت اثر ہوا، اور اُس کے خیالات کا جا بجا

چرچا ہونے لگا۔ شمشاد نے ان خیالات کی تبلیغ اس لئے کی تھی، کہ غریب اور نادار لوگوں
میں جو پستی اور ناخود شناسی پائی جاتی ہے، وہ دور ہو جائے۔ غریب لوگ عام طور پر
امیروں اور راجاؤں کے عیش و عشرت اور ٹھاٹ باٹ کے قصے سُن کر، اپنے کو بہت ہی
پست اور ذلیل محسوس کرتے ہیں۔ اور یہی ذلت کا احساس اُن کو سوسائیٹی میں
کسی طرح اُبھرنے کا موقعہ نہیں دیتا۔ اور امیری اور غریبی کے تصورات اُن کو آگے نہیں بڑھنے
دیتے۔ عام طور پر لوگوں کی صحبتوں میں، امیروں اور راجاؤں کی باتیں اور انکی داستانیں
بیان کیجاتی ہیں، چھوٹے بچے بھی ان کو سُن کر یہہ محسوس کرنے لگتے ہیں، کہ عزت اور شرافت
کا معیار بس جاہ و دولت ہے، اس قسم کے مذاکرے، حقیقت میں نسلوں کو تباہ کرتے ہیں،
اور لوگوں میں اُبھرنے کا احساس اور اپنی عزت آپ کرنے کا جذبہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ امارت
اور دولت کے یہہ تذکرے، خود داری اور عزت نفس کے دشمن ہیں، شمشاد کا اپنے خیالات
کی تبلیغ سے یہی مقصد تھا، کہ قیصر پور کے لوگوں میں خودداری کا احساس پیدا ہو جائے
اور وہ دولتمندوں اور امیروں کے مقابلہ میں اپنے کو فروتر نہیں بلکہ برتر سمجھیں۔ اُس نے
لوگوں سے کہا کہ تکبر یقیناً بُری چیز ہے، لیکن متکبر کیساتھ تکبر کا برتاو کرنا بہت بڑی نیکی
ہے۔ جو تم سے جُھک کر ملے، اُس کے پاؤں چوم لو، اور جو تم سے اکڑ کر پیش آئے، اُس کا
سر بھی نہ ٹھکراؤ۔

مساوات

قیصر پور میں چند دولتمند اور زمیندار رہتے تھے، شمشاد کی باتوں پر ان کے کان
کھڑے ہوئے، اور اسکی تبلیغ کو اُنہوں نے شبہ کی نگاہ سے دیکھا۔ قیصر پور کی پبلک

شمشاد کی بالکل مٹھی میں تھی، اِس لئے یہہ لوگ شمشاد کی کھل کر مخالفت نہ کر سکتے تھے، اپنی خاص محفلوں میں یہہ لوگ شمشاد کو بُرا بھلا کہتے تھے شمشاد کو بھی معلوم ہو گیا، کہ مالداروں کا طبقہ اُس کی تبلیغ کو پسند نہیں کرتا۔

شمشاد نے ان لوگوں کے پاس آنا جانا شروع کیا، اور اپنے اصل مقصد اور اُسکے تمام پہلوؤں سے اُن کو آگاہ کرنیکی کوشش کی۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ شمشاد اُن کی دولت چھین کر، غریبوں میں تقسیم کر دینا چاہتا ہے، شمشاد نے اُن کو بتایا کہ وہ زمینداروں اور دولتمندوں کا دشمن نہیں ہے، وہ یہہ نہیں چاہتا کہ اُن کا روپیہ لُوٹ کر، لوگوں میں بانٹ دے۔ بلکہ وہ امیروں اور زمینداروں میں غریبوں اور پریشان حالوں کی پریشانی کا احساس پیدا کرانا چاہتا ہے، اُس کا مقصد یہہ ہے کہ مالدار لوگ، غریبوں کو ذلت اور حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھیں، بلکہ اُن کیساتھ برابری کا برتاؤ کریں، اور اُن کے دُکھہ درد میں شریک ہوں، مالداروں اور زمینداروں کو اس ملعون اور مردود خیال کو چھوڑ دینا چاہیئے کہ غریب لوگ اُن کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں، اور اُن کو "سرکار، حضور" کہہ کر پُکاریں ــ امیروں اور زمینداروں کو اپنے عیش و آرام اور فضول خرچی کے شعبوں کو کم کر کے، غریبوں اور پریشان حالوں کی امداد کرنی چاہیئے کہ یہی دولت کا بہترین مصرف اور خدا کی دی ہوئی نعمت کے شکر ادا کرنے کا سب سے اچھا ذریعہ ہے، خدا نے دولت، اینٹ پتھروں کی سجاوٹ، چنگ و بربط کے نغموں سے لُطف اندوز ہونے اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے لئے نہیں دی، دولت اسی لئے دیجاتی ہے کہ خود کھاؤ، اور دوسروں کو کھلاؤ، جس طرح تم اچھا کھانا، اور اچھا پہننا جانتے ہو، دوسرے بھی تمھاری طرح جسم اور جان رکھتے ہیں، جاڑوں میں اگر تم مخمل کے گدوں اور اطلس کے نرم لحافوں کو نہیں چھوڑ سکتے

توکم سے کم اتنا تو کرو کہ غریبوں کے لئے کھدر کے لحاف فراہم کر دو، تم قورمہ کھاتے ہو، تو اُن کے لئے اطمینان کیساتھ دو وقت دال، روٹی کھانے کا انتظام کر دو۔

شمشاد کی باتوں کا قیصر پور کے دولتمند طبقہ پر بڑا اثر ہوا، اور مالداروں نے اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا کہ ہم میں واقعی بہت سی کمزوریاں موجود ہیں، جن کے دور کرنے کیلئے ہم انتہائی کوشش کریں گے۔ جو مالدار مسلمان تھے، انہوں نے پابندی کیساتھ زکواۃ ادا کرنی شروع کی، اور زکواۃ کے علاوہ بھی تھوڑی، بہت رقم پبلک کے کاموں میں وہ لوگ دینے لگے، ہندوؤں نے بھی اس طرف توجہ کی، اور اُنکی آمدنی میں سے ایک حصہ پبلک کاموں کے لئے لیا جانے لگا۔ قیصر پور کے بعض کھاتے پیتے ہندو، صبح سویرے شکر، بتاشے اور گڑ لیکر قصبہ کے باہر، چیونٹیوں کے سوراخوں میں ڈالا کرتے تھے، شمشاد نے اُن لوگوں کو سمجھایا کے یہہ کوئی ثواب اور پُن کا کام نہیں ہے۔ روپیہ کا یہہ بالکل بے محل مصرف ہے، اُس نے کہا کہ گھوڑے، گائے، بھینس، بیل، بکری، وغیرہ جانور، جن سے ہم کام لیتے ہیں، اُنکی روزی مُہیا کرنا واقعی ہمارا فرض ہے، اگر ہم اُن کے معاملہ میں کوتاہی کریں گے تو یہہ بڑا ظلم ہوگا، لیکن چیل، کبوتر، ہرن، سانپ، بچھو، بندر، چیونٹے وغیرہ جانداروں کی روزی کی فراہمی انسانوں کے ذمہ نہیں کی گئی، یہہ جاندار اپنی روزی خود مُہیا کرتے ہیں، شمشاد نے کہا کہ بھوکے انسانوں کو چھوڑکر، چیونٹوں کو شکر اور بتاشے کھلانا، ثواب نہیں ظلم ہے، ہندوؤں نے شمشاد کی باتوں کا بہت اثر لیا۔ اور اس طرح ہر مہینہ کافی رقم پبلک کاموں کے لئے جمع ہونے لگی۔

قیصر پور کا ایک مہاجن، جس کی زندگی کا مقصد اعلیٰ دولت بٹورنا اور سُود لینا تھا، شمشاد کی باتوں پر بہت چراغ پا ہوا۔ شمشاد نے اُس مہاجن کو بہت کچھ سمجھایا

کہ جب سب لوگوں نے ایک بات کو مان لیا ہے، تو تم کو بھی اُس کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ مگر اُس کنجوس ظالم نے شمشاد کی ایک نہ سُنی، اب شمشاد کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا تھا کہ وہ اُس مہاجن کو سوسائیٹی کا دباؤ ڈال کر درست بنا دے۔ چنانچہ شمشاد کی تحریک پر اُس کا حقہ پانی بند کیا گیا، اور تمام لوگوں نے اُس کا بائیکاٹ کر دیا۔ مہاجن کے پاس دولت بہت تھی، لیکن گھر، باہر کا کام کاج کرنے کے لئے دولت کے ہاتھ، پاؤں تھوڑی ہوتے ہیں۔ اس کے نوکروں نے ہڑتال کر دی تھی، بازار سے، کوئی اُسے سودا سلف بھی مول نہ دیتا تھا، وہ سخت پریشانی میں مُبتلا تھا۔ مہاجن کو اب قدر ہوئی کہ اُس کے غریب نوکر، جن کو وہ ذلیل سمجھتا تھا، کتنے کام کے آدمی تھے" اُن کے بغیر اس کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا۔ اور روپیوں سے بھری ہوئی تجوریاں، اور لینے چوڑے بہی کھاتے، غریبوں کی امداد کے بغیر بیکار ہیں۔ پہلے پہل تو مہاجن کو بہت غصہ آیا، وہ ضلع میں پہونچا، اور افسروں کی جھوٹی سچی باتیں باور کرا کے، حاکم پرگنہ کو قیصر پور بلا کر لے آیا۔ حاکم نے قیصر پور کے لوگوں سے تبادلہ خیال کیا تو معلوم ہوا کہ واقعی وہاں کے لوگوں نے اُس مہاجن کا بائیکاٹ کر دیا ہے، ڈپٹی صاحب نے لوگوں کو ڈرایا دھمکایا کہ تم ایسا کرو گے، تو تم پر مقدمہ قایم کر دیا جائیگا، ڈپٹی کی اس دھمکی کا بڑا سخت جواب دیا گیا، ڈپٹی نے قیصر پور میں دو، تین دن رہ کر، اس بات کا اندازہ لگایا، کہ یہاں کے لوگوں میں بہت زیادہ ایکا ہے، اور وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں، شمشاد نے ڈپٹی سے کہا کہ ہم اپنی اصلاح کر رہے ہیں، اور اپنی اصلاح کرنا اور اپنی بہتری کے لئے تدبیرین سوچنا کوئی جُرم نہیں ہے، بلکہ ہم نے تو اس کام کا بیڑا اُٹھایا ہے، جو حکومت کو کرنا چاہیئے تھا، اس لئے ہم قابل عتاب وملامت نہیں، بلکہ لایق تعریف تحسین

ہیں کہ حکومت کی ذمہ داریوں کے بار کو ہم ہلکا کر رہے ہیں۔

ڈپٹی نے یہہ صورتِ حال دیکھ کر، مہاجن سے کہا کہ حکومت اس میں دخل دیکر اپنی مشکلات میں اضافہ کرنا نہیں چاہتی، تم کو اگر قیصر پور میں رہنا ہے تو مل جُل کر رہو، مہاجن نے چند دن کے لئے، اپنی روش میں نرمی پیدا کرلی، لیکن جب اُس سے سُود معاف کرنے کے لئے کہا گیا، تو وہ بہت سٹ پٹایا، اور اُس نے آخر کار، قیصر پور کی سکونت ترک کردی، اُس مہاجن کے جانے کے بعد، قیصر پور کی فضا بالکل پاک ہوگئی۔

قیصر پور کے دولتمند، اور امیر لوگ، غریبوں اور مزدوروں کیساتھ، نہایت محبت اور صاف دلی کیساتھ پیش آنے لگے، شمشاد نے امیروں کی ذہنیت بدلنے کے لئے امیروں پر اس بات کو فرض کردیا کہ سلام آداب اور نمسکار میں، وہ مسابقت کریں، چنانچہ قیصر پور کی گلیوں میں لوگوں نے دیکھا کہ مزدور، کاندھے پر پھٹا ہوا بورا ڈالے چلا جا رہا ہے، اور ایک مالدار شخص فٹن میں بیٹھ کر، اُس مزدور کو سلام کر رہا ہے۔ امیروں اور دولتمندوں کے یہاں امیری، غریبی کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہا تھا، دعوتوں اور جلسوں میں امیر، غریب سب ایک جگہ مل جل کر بیٹھتے تھے۔ پہلے پہل، تو دولتمندوں نے اپنے طرزِ زندگی کی تبدیلی میں تکلیف محسوس کی، کہ لیکن بعد میں اُن کو معلوم ہوا کہ زندگی حقیقت میں سادگی، بے تکلفی، اور ابنائے جنس کی ہمدردی کا ہی نام ہے۔ وہ لوگ اب دوسرے لوگوں کی امداد میں، ایک خاص لذت محسوس کرنے لگے، غیریت اور اجنبیت کے حجابات ایک ایک کرکے چاک ہوچکے تھے، ہر شخص، دوسرے کو اپنے سب سے قریب سمجھتا تھا، ہمدردی اور باہمی امداد کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوگیا تھا، اور سب لوگ امن و اطمنان کی زندگی بسر کر رہے تھے، دو سال کے اندر، ایک مقدمہ بھی سرکار کی عدالت

میں نہیں گیا، اوّل تو جھگڑے ہی کم ہوتے تھے، اور کبھی جھگڑا ہو جاتا تھا، تو آپس کے لوگ جھگڑے کو چکا دیتے تھے۔

دوسرا قدم

شمشاد نے کوشش کر کے ایک فنڈ قایم کرا دیا تھا، جس سے مزدوروں اور کسانوں کو ضرورت کیوقت امداد دیجاتی تھی، مزدوروں کی شرح اُجرت اس قدر کافی مقرر کی گئی تھی، کہ ایک دن کی مزدوری میں، ایک کسان اپنے بال بچوں کے لئے فراغت کیساتھ، دو وقت کا کھانا فراہم کر سکتا تھا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ ہندوستان کی زمین سونا اُگلتی ہے، اپنی جگہ پر یہہ بات بالکل ٹھیک ہے، لیکن وہ کسان جو اپنا خون، پسینہ ایک کر کے زمین سے سونا نکالتا ہے، ایک ایک پیسہ کے لئے ترستا ہے، اور اُس غریب کو کبھی اطمینان اور چین کی زندگی نصیب نہیں ہوتی۔ غلہ کی منڈی کے بھاؤ کی کمی، بیشی مہاجنوں اور تاجروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہ اپنے حالات کے لحاظ سے بھاؤ کو اُتارتے، چڑھاتے رہتے ہیں کسان کو لگان، نقدی کی شکل میں دینا ہوتا ہے اسلئے نقدی حاصل کرنے کے لئے پیداوار کو منڈی میں جا کر بیچنا ضروری ہے، اور منڈی کے "ڈکٹیٹر" مہاجن اور بنیے ہوتے ہیں، لہذا کسان کو ہمیشہ ایک نئی مصیبت سے سابقہ پڑتا ہے۔

انسانوں اور جانوروں کیساتھ بیماریاں اور دُکھ تو لگے ہوئے ہیں، عین تخم ریزی کے وقت، کسی کسان کا بیل مر گیا، یا بیمار ہو گیا، اُس غریب کے پاس

بیل مول لینے کے لئے روپیہ تو ہو ہی نہیں سکتا، ہاں! چند من غلہ ضرور موجود ہے سو اس غلہ کو اگر وہ فروخت کر ڈالے، تو اس کا کنبہ فاقہ کرنے لگے، اس لئے مجبوراً اس کو کسی مہاجن کے پاس سودی قرضہ لینے کے لئے جانا پڑتا ہے، یہہ ہندوستان کے مہاجن اور بنیئے، یہودیوں سے بھی زیادہ لالچی اور ناخدا ترس ہوتے ہیں، ضرورتمند انسان کی ضرورت اور پریشان حالی سے ان کو فائدہ اٹھانا خوب آتا ہے۔

یہہ غریب کسان، جس کا بیل مرگیا ہے، کسی مہاجن کے یہاں قرض لینے کے لئے جاتا ہے، مہاجن، جس کی توند، گاؤ تکیہ کو بھی شرماتی ہے، قالین پر لیٹا ہوا حقّہ پیتا ہوتا ہے، کسان کو دیکھتے ہی وہ اپنے "عقل کل" منیم کو برا بھلا کہنے لگتا ہے کہ تمام روپیہ اُدھار میں بانٹ دیا، کسان بیچارہ، اس گفتگو کو سن کر سہم جاتا ہے، اور اب مہاجن من مانی شرح سود پر جو قرضہ عنایت فرماتے ہیں، تو وہ گویا بیچارے کسان پر بڑا کرم کرتے ہیں، اور بھولا بھالا کسان بھی یہی سمجھتا ہے کہ مہاجن نے قرض دیکر، اُس پر بڑا احسان کیا ہے۔ کسان، روپیہ لے کر خوشی خوشی گھر جاتا ہے، اور اپنے گاؤں سے، یا بازار سے بیل خرید لیتا ہے۔

اب یہہ کسان، مہاجن کے چکر سے عمر بھر نہیں نکل سکتا، سود کا پھیلاؤ خدا کی پناہ! دادا قرض لے، اور پوتا چکائے، پھر بھی کچھ نہ کچھ باقی رہ جائے، کسان کو اپنی پیداوار کا ایک حصہ بصورت نقدی، سود میں دینا پڑتا ہے، اور "اصل" بدستور اپنی جگہ قایم! ضرورتیں تو آئے دن نکلتی ہی رہتی ہیں، اب جب کبھی کسان کو روپیہ کی ضرورت پڑتی ہے، تو وہ اُسی مہاجن کے پاس سودی قرضہ لینے کے لئے جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ اُس ساہوکار کی "اسامی" بن جاتا ہے"

اور عمر بھر سود کے پھندے سے نہیں نکلنا - ان مہاجنوں، ساہوکاروں اور بنیوں کے ہاتھوں، کسانوں کی زندگیاں تباہ ہیں، اور ان ظالموں کے لانبے چوڑے بہی کھاتے، ان غریبوں کے تقدیر کے نوشتے ہیں، اُن میں جو لکھا ہوگا، وہ پُورا ہو کر رہے گا۔

قیصر پور میں شمشاد کی کوششوں نے ایسا معقول انتظام کردیا تھا کہ کسانوں کو، مہاجنوں اور ساہوکاروں سے سودی قرضہ لینے کی ضرورت ہی پیش آتی تھی، قصبہ میں ایک فنڈ قایم ہوگیا تھا، جس سے کسانوں کو قرض حسنہ دیا جاتا تھا، اور بعض بہت زیادہ غریب اور غیر مستطیع کسانوں کی امداد بھی کیجاتی تھی۔ قصبہ کے کسان اور مزدور، شمشاد پر جان چھڑکتے تھے، شمشاد جب کھیتوں میں جاتا تو کسانوں کے بچے، اُسے گھیر لیتے، شمشاد اُن کو پُر لطف باتیں سُنا کر، خوب ہنساتا، اُن کیساتھ آنکھ مچولی کھیلتا، بچے خوش ہو کر، سرسوں کے پھول اُس پر نچھاور کرتے۔

گاؤں کے بچوں کے لئے، مختلف محلوں میں کئی مدرسے قایم کئے گئے ان مدرسوں میں امتحان پاس کر کے، سند حاصل کر لینے کے لئے تعلیم نہیں دیجاتی تھی، بلکہ تعلیم کا مقصد تھا شعور کی تربیت اور کردار کی پاکیزگی ایسی تعلیم جو بچوں کے شعور کو ترقی دے سکے، اور اُن کے دل و دماغ کو روشن بنا سکے، کسانوں کے بچوں کیلئے کھیتی باڑی کی مفید باتیں بھی بتائی جاتی تھیں، ہندوستان کے کالجوں اور اسکولوں میں جو شاندار کرسیاں، میزیں اور تپائیاں پائی جاتی ہیں، اور جہاں کے لڑکے اور لڑکیاں ہر وقت "غلمان" و "حور" بنے رہتے ہیں، اور جس ماحول میں بہت

پالنے کے بعد، آدمی محنت و مشقت کا عادی نہیں رہتا، اور وہ ہر وقت "کلکٹر"
اور "تحصیلدار" بننے کے خواب دیکھا کرتا ہے، قیصر پور کے مدرسوں میں اُس تہذیب
و تعلیم کا ایک نقش بھی نظر نہ آتا تھا، یہاں کے مدرسوں کا ماحول بالکل سادہ
اور فطری تھا یہاں بچوں کو "انسپکٹر" "ڈپٹی" اور "ہیڈ کلرک" بنانے کے لئے
نہیں، بلکہ کسان، لوہار، بڑھئی اور دوکاندار بنانے کے لئے تعلیم دیجاتی تھی۔ ان
مدرسوں میں ایسے اُستاد کام کرتے تھے جو اسکول کے اوقات کے علاوہ بھی بچوں
کے کردار و اخلاق پر نگرانی رکھتے تھے، ان مدرسوں کے اُستاد، کالجوں اور اسکولوں
کے اُن پروفیسروں اور ماسٹروں سے بالکل مختلف تھے، جو اپنے شاگردوں کے ساتھ
ایک موقعے پر بیٹھ کر ننگا ناچ بھی دیکھ سکتے ہیں، اور جو کلاسوں میں نصاب پڑھا کر
یہہ سمجھتے ہیں کہ اُنہوں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔

مدرسوں کے بچوں کی ورزشِ جسمانی کے لئے، ایسے کھیل مقرر کئے گئے تھے،
جو ایک طرف تو بچوں کی جسمانی صحت کے لئے مُفید تھے، دوسری طرف اُن کھیلوں
کی مشق، بچوں کی آئندہ زندگی میں بھی کام آسکتی تھی بعض لوگوں نے انگریزی
کھیلوں کا ذکر نکالا تو شمشاد نے کہا کہ انگریزی کھیل، ہندوستانی بچوں
کے لئے قطعاً ناموزوں اور غیر مفید ہیں۔ انگریزی کھیلوں پر جتنا صرف ہوتا
ہے اُتنے روپیہ سے کئی مدرسے قایم کئے جا سکتے ہیں، مغرب کے رہنے والوں
کے پاس روپیہ کی بہتات ہے، وہ اپنے کھیلوں کے مصارف برداشت کر سکتے
ہیں، مگر وہ ہندوستان، جہاں لاکھوں خدا کے بندے رات کو بھوکے سوتے
ہیں، وہاں ان "شاہی کھیلوں" کی کھپت نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ

کرکٹ، فٹ بال، ہاکی، ٹینس، بیڈمنٹن سے اگرچہ جسمانی ورزش تو ہو جاتی ہے، مگر انسان کی زندگی میں ان سے کبھی کام نہیں پڑتا، کرکٹ کا بہترین کھلاڑی، زندگی کی منزل میں کس کام کا! اور ٹینس کے چمپین کو زندگی کی بھاگ دوڑ سے کیا سروکار۔!
گاؤں کے کھیل البتہ اس قسم کے ہیں، جن سے زندگی کے بہت سے کام نکل آتے ہیں، مثال کے طور پر، وہ کھیل، جس میں ایک لڑکا چور بن کر بھاگتا ہے، اور ایک پارٹی اس کا پیچھا کرتی ہو، کتنا مفید کھیل ہے، کبڈی کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے، کبڈی کا کھلاڑی، دشمنوں کے نرغہ سے نکلنے اور بھاگتے ہوئے دشمن پر حملہ کرنے کے ڈھنگوں سے واقف ہو جاتا ہے ظاہر ہے کہ زندگی میں ایسے بہت سے مواقع آتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر بھی، غیر ملکی کھیلوں کے قبول کرنے کے یہ معنیٰ ہیں کہ ہم ذہنی طور پر دوسروں کے غلام ہیں، لہٰذا ہم کو وہ کھیل کھیلنے چاہئیں جو ہمارے کھیل قومی اور ملکی شعور کو ترقی دیتے ہوں، اور ہماری ملکی ضروریات اور داعیات کی بدولت ظہور میں آئے ہوں۔

غرض شمشاد نے قیصرپور کے ماحول کو "بہشت کدہ" بنا دیا۔ ہر شخص اپنی جگہ مطمئن اور شادماں تھا، بیواؤں کی آہوں، یتیموں کے آنسوؤں اور مصیبت زدوں کی فریادوں کے لئے، قیصرپور کی فضا میں گنجایش ہی نہ تھی، وہاں تو خدا کے شکر کے ترانے، بچوں کے قہقہے، معصوم لڑکیوں کی مسکراہٹیں اور کسانوں کے گیت فضا میں گونجتے تھے۔

ضلعدار کی لڑکی

اسی زمانہ میں، جب کہ شمشاد قیصرپور کی تنظیم کر رہا تھا، محکمہ ہند کے ایک ضلعدار نے

قیصرپور کو اپنا مستقر بنالیا تھا۔ کچھ دن تک تو یہہ ضلعدار تنہا رہا، اُس کے بعد وہ اپنے بال بچونکو بھی وہاں لے آیا۔ یہہ ضلعدار ایک کرایہ کے مکان میں رہتا تھا، اور اسی مکان کے ایک حصہ میں اُس کا دفتر تھا، شمشاد، کو قیصرپور میں غیر معمولی ہردلعزیزی حاصل تھی، سب لوگ اُس کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، محکمہ ہند کے ضلعدار نے بھی شمشاد سے ربط، ضبط بڑھانا شروع کیا، شمشاد بہت جلد گھل مل جانے والا نوجوان تھا، ضلعدار اُس سے بہت جلد مانوس ہوگیا، اور دونوں ایک دوسرے کے گھر آنے جانے لگے۔

ایک دن شمشاد، ضلعدار کے مکان کے مردانے حصہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ اُس کے کان میں عورت کے گانے کی آواز آئی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی شخص، کسی لڑکی کو موسیقی کی تعلیم دے رہا ہے تھوڑی دیر میں بالکل صاف آواز آنے لگی، اسپر شمشاد نے ضلعدار سے پوچھا کہ اندر کون گا رہا ہے؟ ضلعدار نے جواب دیا کہ میری لڑکی کو موسیقی سے بہت دلچسپی ہے، ایک شخص جو فنِ موسیقی میں بڑی مشق و مہارت رکھتا ہے، ہر اتوار کو ضلع سے آکر اُسے موسیقی کی تعلیم دیتا ہے۔ شمشاد نے اس سلسلہ کو اُس وقت طول دینا مناسب نہ سمجھا، وہ اُس وقت تو کچھ کہے سُنے بغیر چلا گیا، لیکن اس واقعہ کے ایک ہفتہ کے بعد، موقعہ پاکر اُس نے ضلعدار سے اس ذکر کو چھیڑا۔

ضلعدار صاحب! آپ نے اُس دن فرمایا تھا کہ آپکی صاحبزادی موسیقی کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں ــــ شمشاد نے دریافت کیا۔

جی ہاں! کوئی ایکسال سے میری لڑکی شریفہ، موسیقی سیکھ رہی ہے، شریفہ کو موسیقی سے فطری مناسبت ہے، آواز میں قدرت نے لوچ دیا ہے، ایکسال میں اُس نے

غیر معمولی ترقی کی ہے۔ فلم کے بہترین ریکارڈوں کی ایسی
نقل اُتارتی ہے۔ جیسے سچ مچ ریکارڈ بج رہے ہیں۔ ضلعدار نے جواب دیا۔

یہہ جو صاحب، آپ کی صاحبزادی کو موسیقی سکھانے
کے لئے آتے ہیں، اُن سے آپکی صاحبزادی غالباً پردہ تو کرتی
ہونگی ——————— شمشاد بولا۔

شمشاد صاحب! آپ تو خلیفہ ہارون رشید کے
زمانہ کی باتیں کر رہے، کہیں اُستادوں سے پردہ کیا جاتا ہے
اور جو شخص شریفہ کو موسیقی سکھانے کے لئے آتا ہے، وہ تو قسم
خدا کی فرشتہ ہے، فرشتہ! ——————— ضلعدار نے سگرٹ
سلگاتے ہوئے جواب دیا۔

اچھا! تو آپ شریفہ کو موسیقی اس لئے سکھا رہے
ہیں کہ اُس کو اِس فنِ لطیف سے فطری مناسبت اور طبعی
دلچسپی ہے ——————— شمشاد نے دریافت کیا

جی ہاں! یہہ وجہ بھی ہوسکتی ہے، مگر سب سے بڑی
وجہ یہ ہے کہ شریفہ کی جس شخص کیساتھ نسبت ہونیوالی ہے
اُس کی فرمایش ہے کہ لڑکی کو موسیقی کی تعلیم دیجائے ——— ضلعدار نے جواب دیا۔

ضلعدار صاحب! میں آپ کا دوست ہوں، اور
دوست کا فرض ہے کہ اپنے دوست کو کسی خطرناک اور
پریشان کُن غلطی میں مُبتلا نہ ہونے دے سب سے پہلی

چیز جو صد درجہ قابل اعتراض ہے، وہ آپکی صاحبزادی کا ایک غیر مرد کے سامنے بے پردہ ہونا ہے، میں بدگمانی سے بالکل خالی الذہن ہو کر عرض کرتا ہوں، کہ جس شخص کو آپ فرشتہ سمجھتے ہیں، اُس کے کردار کا آپ کو کس حد تک تجربہ ہے؟ اور بالفرض وہ آپ کے بقول فرشتہ ہی ہے، تو بھی مذہب اِسلام نے عورت اور مرد کے درمیان، احتیاط کی ایک حد قایم کر دی ہے، اور وہ اس لئے کہ انسانی نفس میں ہزاروں چوریاں اور بُرائیاں چھپی ہوئی ہیں، اور اگر ایک فرشتہ صفتِ انسان کو ڈھیل دیدی جائے یا اس کو مواقع حاصل ہوں، تو اُسکی لغزش کا ہر وقت امکان ہے، اور اس بات کا فیصلہ ہر شخص اپنے نفس کا جائزہ لے کر خود ہی کر سکتا ہے ———— شمشاد نے جواب دیا۔

شمشاد صاحب! میں تو آپ کو بہت روشن خیال سمجھتا تھا، مگر یہہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کہ آپ بھی مسجد کے مُلاؤں کی طرح تنگ خیال ہیں، آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ دُنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔ تہذیب و تمدن نے کتنے جدید مسایل ہمارے سامنے پیش کر دیے ہیں، اور انقلاب کی رفتار معاشرت کو کس قدر بلند دیکھنا چاہتی ہے۔

مذہب نے عورت اور مرد کے درمیان پردے کی جو احتیاطی حد قایم کی ہے، اُس کا میں قایل نہیں ہوں، زمانہ کا انقلاب اُس حد کو خود بخود توڑ رہا ہے۔ اور اب نقابوں اور برقعوں کا زمانہ نہیں رہا ——————— ضلعدار نے تیز آواز میں کہا۔

آپ کے اظہار تاسف کا شکریہ! تو آپ اُن لوگوں میں سے ہیں، جو ہوا کے رُخ پر چلتے ہیں، وہ خود اپنا کوئی نصب العین نہیں رکھتے، زمانہ ایک چیز کو آج اچھا سمجھتا ہے، تو وہ بھی اُسکی اچھائی کے قایل ہوجاتے ہیں، کل زمانہ اُسکی بُرائی کا فتوی دیتا ہے، تو یہہ بھی زمانہ کی ہاں ہاں میں ملانے لگتے ہیں۔ اس لحاظ سے عرب کے وہ جُہلاء جو ذرا سی بات پر خون کے دریا بہا دیتے تھے، اور شراب، جوا، بدکاری اور ایسے ہی بہت سے فواحش، اُن کی زندگی کا جز بن گئے تھے، کسی طرح بھی قابل ملامت نہیں ہیں، اس لئے کہ اُس زمانہ کا تمدن ان ہی چیزوں کو پسند کرتا تھا اور عرب کی جاہلیت کا تمدن یقیناً اسی نقطۂ نظر سے قابلِ تعریف تھا ——————— شمشاد نے جواب دیا

یہہ کون مردود کہتا ہے کہ عرب کا وہ تمدن جس نے جاہلیت میں نشو و نما پائی تھی اچھا تھا، آپ تو آج کچھ بھی

بہکی سی باتیں کر رہے ہیں ـــــــــــ ضلعدار نے کہا۔

آپ نے عرب کے تمدن کا ذکر نہیں کیا، لیکن آپ کی گفتگو سے یہہ نتیجہ خود بخود نکلتا ہے، کہ زمانہ کے پیدا کئے ہوئے تمدن، اور جدید مسایل کی تقلید کرنی چاہیئے، تو اس صورت میں اچھائی اور برائی کا تو کوئی معیار ہی نہیں رہا اس نقطۂ نگاہ کے تحت تو تمدن جس بات کو اچھا بتاتا ہی وہ اچھی ہے، اور تمدن جس کو برا کہتا ہے بری ہے۔

ضلعدار صاحب معاف فرمایئے! آپ جس تمدن کو روشن اور آزاد سمجھتے ہیں، وہ عیاشی اور مادی دماغوں کی پیداوار ہے، جو تمدن، عورتوں کے رقص عریاں، شراب، قمار بازی اور اس قسم کے بہت سے فواحش پر فخر کرتا ہو، کیا اس تمدن سے انسانیت کی کوئی خدمت ممکن ہے

عورت کی عظمت اور اس کی آزادی سے کس کو انکار ہے، مگر یورپ کے تمدن نے، عورت کو بے حیائی اور فحاشی کی اس منزل میں کھڑا کر دیا ہے، جس کا ڈانڈا، کتے اور سور کی زندگی سے ملتا ہے، اب اگر کوئی اس تمدن پر حرف گیر ہوتا ہے تو آپ اس کو کٹھ ملا، قدامت پرست اور تنگ خیال بتاتے ہیں ـــــــــــ شمشاد میز پر جھکتے

ہوئے بولا۔

آپ تو یورپ کی سُنی سنائی باتوں کے سبب، بہت بدگمان ہو گئے ہیں، کوئی شک نہیں کہ وہاں بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں، مگر آپ تو رائی کا پہاڑ بنا رہے ہیں ——————— ضلعدار نے جواب دیا۔

ضلعدار صاحب! مجھے آپ کے حُسن ظن اور نیک گمانی پر افسوس آتا ہے۔ کیا آپ یورپ کے اخباروں اور رسالوں کا مطالعہ نہیں فرماتے، اور کیا آپ کسی ایسے شخص سے نہیں ملے، جس نے یورپ جاکر وہاں کی زندگی کا مطالعہ کیا ہو، میں نے زیادہ تفصیل میں جانے کی کوشش نہیں کی، ورنہ سچ تو یہہ ہے کہ مغرب کے لوگ عرب کے جاہل وحشیوں سے بہت زیادہ آگے ہیں وہاں کے اخلاق و کردار کا یہہ عالم ہے کہ لفظ "دوشیزگی" صرف کتابوں میں لکھا ہوا ملتا ہے، ننگی پنڈلیاں، کھلا ہوا سینہ، ناچ، رنگ، پاوڈر، وسیلین، سیر و تفریح، بے باکی بس ان ہی چیزوں کا نام "عورت کی آزادی" ہے ——————— شمشاد نے کہا۔

مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ یورپ کے تمدن میں بے احتیاطیاں پائی جاتی ہیں، لیکن، جناب!

عیبِ مے جُملہ بگفتی ہُنرش نیز بگو!

وہاں عورتوں کو معاشرت میں برابر کا حصہ دیا جارہا ہے، عورتیں اِس قابل بنائی جارہی ہیں کہ اپنے پاؤں پر خود کھڑی ہو سکیں، اور مردوں کی دست نگر بن کر نہ رہیں، ——— ضلعدار نے جواب دیا۔

ضلعدار صاحب! رونا تو اسی کا ہے کہ ہم یورپ کے تمدن کے تمام مسایل کو قبول کرتے چلے جاتے ہیں، اور اُن پر غور کرنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے، اسی "مرعوبیت" نے ہمارے دماغوں اور خیالوں کو "مغرب زدہ" بنا دیا ہے، اور ہماری مذہبی اور تمدنی خصوصیات ایک ایک کر کے فنا ہو رہی ہیں۔

بظاہر تو یہہ چیز بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے کہ عورتوں کو معاشرت میں برابر کا حصہ دار بنایا جائے، عورتیں بیرسٹر بنیں، جج بنیں، سپرنٹنڈنٹ پولس بنیں، کمانڈر انچیف بنیں، غرض کاروبار کی تمام شعبوں میں اُن کو داخل کر لیا جائے، لیکن فطری طور پر یہہ چیز، بالکل اُلٹی اور فطرت کے حدود سے افسوس ناک تجاوز ہے۔

مرد اور عورت، داخلی اور خارجی، جسمانی اور فطری اعتبار سے، مختلف واقع ہوئے ہیں، اس چیز کو

سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے، ہر شخص معمولی تفکر کے بعد اس بات کو سمجھ سکتا ہے، عورت کے قواء مرد کے قواء کے مقابلہ میں نازک لطیف اور ذکی الحس ہیں، وہ سخت کام جن کو مرد انجام دیتا ہے، ان کو اگر عورت ہاتھ لگائے گی تو اسکی جسمانی ساخت کو صدمہ پہنچیگا، اور دوسرے معنی میں وہ اُن حدود سے تجاوز کریگی، جو اس کیلئے مقرر کیگئی ہیں، پھول کی ڈالی کی اہمیت اور لطافت سے کون انکار کرسکتا ہے لیکن اگر آپ اُس سے چھڑی کا کام لیں گے، تو آپکا یہہ فعل پھول کی نازک ڈالی پر بڑا ظلم ہوگا۔

علم تشریح الابدان نے یہہ چیز ثابت کردی ہے، کہ عورت، اور مرد، دماغی طاقت کے اعتبار سے بھی مختلف ہیں، چنانچہ عورت کے دماغ کا وزن، مرد کے دماغ کے وزن سے کم ہوتا ہے، اور یہی حال اُسکی کھوپری کے اُن نشیب وفراز کا ہے جن کو "تلافیق دماغ" کہتے ہیں۔ لہذا یہہ تصور بالکل غلط ہے کہ عورت اور مرد، یکساں فرائض انجام دے سکتے ہیں۔

تو عورتیں ناقص العقل ہیں! ——————— ضلعدار، بات کاٹتے ہوئے بولا۔

ناقص العقل نہیں، بلکہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ مرد ول کے مقابلہ میں اُنکی جسمانی اور دماغی ساخت یقیناً کمزور ہے، اور اِس سے عورتوں کی توہین کا پہلو نہیں نکلتا، اور وہ اِس لئے کہ

اُن کو جس کام کے لئے بنایا گیا ہے" وہ خود اپنی جگہ انتہائی اہم ہے، اور جب عورت، اپنے کام کو چھوڑ کر، مرد کے کام پر ہاتھ ڈالیگی تو وہ یقیناً فطرت کی نظر میں خطا کار ٹھیریگی۔

آپ خود غور فرما سکتے ہیں کہ عورت پر بلوغ کے بعد کتنی پابندیاں عاید ہوجاتی ہیں، مرد بالغ اور متاہل ہونے کے بعد بھی آزاد ہے، اور عورت شادی ہونیکے بعد کتنی جسمانی تبدیلیوں اور پابندیوں میں گرفتار ہوجاتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد اور عورت اپنے اپنے فرائض میں ایک جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اور دونوں کی مختلف راہیں ہیں، یہ نظام خود فطرت نے مقرر کیا ہے، اس نظام کی جب بھی خلاف ورزی کیجائیگی، نظام معاشرت میں اختلال پیدا ہوجائیگا۔ عورت تدبیر منزل کی ملکہ ہے اُسکا کام گھر کا انتظام اور بچوں کی پرورش ہے مرد کا کام روزی کی فراہمی ہے، لہذا جب عورت تدبیر منزل کی ذمہ داریوں سے گھبرا کر، روزی کی منزل میں آئے گی، فطری نظام تہہ و بالا ہوجائے گا۔

یورپ ہی کو لے لیجئے، کہ وہ اپنے افسوسناک تجربہ پر کس قدر متاسف ہے۔ انسانی نسلوں کی درآمد کی راہیں بند ہورہی ہیں، اور عورتوں نے مرد بننے کی ہوس میں گھریلو زندگی کو قریب قریب خیرباد کہہ دیا ہے۔ اس کے خوفناک

نتائج سے گھبرا کر، یورپ پھر عورتوں کو گھریلو زندگی کی طرف ڈھکیل رہا ہے ——————— شمشاد نے ڈبیہ میں سے، پان نکالتے ہوئے کہا۔

بھئی! آپ کی طرح میں نے منطق تو نہیں پڑھی، اور تمدن و تہذیب کے فلسفہ پر بحث کرنے کے لئے میں تیار بھی نہیں ہوں، شمشاد صاحب! آپ تو بڑے ایرپھیر سے بات کرتے ہیں بات کچھ شروع ہوئی تھی، اور آپ نے بحث کچھ چھیڑ دی - میری لڑکی شریفہ کا جن سے رشتہ ہونیوالا ہے انہوں نے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ لڑکی کو موسیقی کی تعلیم ضرور دلائی جائے، اور میرے خیال میں، اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے ——————— ضلعدار نے جواب دیا

سب سے پہلی برائی تو یہہ ہے کہ ایک نوجوان غیر مرد آپکی صاحبزادی کے دوش بدوش بیٹھ کر تانیں اڑاتا ہے، موسیقی اور شعر کا سب سے بڑا کام، جذبات کو برانگیختہ کرنا ہے، اب آپ خود ہی غور فرمالیجئے، کہ وہ خلوت، جو نغموں سے معمور ہو، اس میں ایک جوان مرد اور جوان لڑکی کا رہنا احتیاط کے کس قدر خلاف ہے، ضلعدار صاحب! یقین جانیئے کہ اس کے صرف تصور سے میرے رونگٹے کھڑے ہوئے لگتے ہیں، میں بدگمانی نہیں کرتا لیکن احتیاط سے توجہ ہٹا لینے کے بعد بے اعتدالیوں کا امکان

ہوسکتا ہے، اور پھر شعر اور نغمہ سے تو اچھے خاصے آدمی کے دل میں گدگدی ہونے لگتی ہے، اور آدمی کا دماغ کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہے۔

اب رہا آپ کے ہونیوالے داماد کا اصرار، سو اُس کے متعلق میں یہہ عرض کرتا ہوں کہ خدا کے لئے ایسے شخص کیساتھ اپنی صاحبزادی کی قسمت وابستہ نہ کیجئے جو اس بات پر نہ صرف رضامند ہے بلکہ مصر ہے کہ اُسکی ہونیوالی بیوی کو ایک غیر مرد سے موسیقی کی تعلیم دلائی جائے۔

جناب ضلعدار صاحب! زندگی صرف غیرت، حمیت اور حیا کا نام ہے، اس سے گذر کر، زندگی باقی ہی نہیں رہتی، مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا، اب آگے آپ کو اختیار ہے ــــ اور ــــ ہاں ــــ

شمشاد پوری بات کہہ بھی نہ پایا تھا کہ محکمہ نہر کے اہلکار اور ملازمین آگئے، اور شمشاد کو سلسلۂ گفتگو ختم کر دینا پڑا۔ اس کے بعد بھی شمشاد نے ضلعدار کو کتنی مرتبہ توجہ دلائی، اور خوب تفصیل کیساتھ سمجھایا، مگر ضلعدار اپنی بات پر قایم رہا۔ بات یہہ ہے کہ جب کوئی مرد اپنی بہن، بیوی، یا کسی اور عزیزہ کو آزادی دیدیتا ہے تو پھر اُس دی ہوئی آزادی کے واپس لینے کی یا اُس پر احتساب اور روک ٹوک کرنے کی اُس کو جرارت نہیں ہوتی سوسائیٹی کی اصطلاح میں اسی چشم پوشی، اور بے حمیتی کا نام آزادی روشن خیالی اور شایستگی ہے، اگر کوئی بھلامانس اپنی بہو بیٹی کی آزاد روش پر روک ٹوک کرتا ہے تو سوسائیٹی کی اصطلاح میں اُس کو تنگ نظر اور قدامت پرست کہا جاتا ہے، اس کو عورتوں کے کیریکٹر پر اعتماد کرنا

چاہیئے، اگر کوئی عورت کسی غیر مرد سے تنہائیوں میں ملتی ہے پیانو کے نغموں سے لوگوں کو خوش کرتی ہے، اور خوب بن سنور کر، کلب گھروں میں جاتی ہے، تو اس سے عورت کے کردار پر کیا اثر پڑتا ہے۔ جو شخص ان باتوں پر روک ٹوک کرتا، تہذیب جدید کی نگاہ میں وہ بدگمانی کا مجرم ہے، خوب کہا، اکبر الہ آبادی نے:۔

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
اُسے غیرت نہیں آتی، اُنہیں غصہ نہیں آتا

۱۰۲

ضلعدار کی لڑکی شریفہ کو جو شخص موسیقی کی تعلیم دیتا تھا، وہ مشن اسکول میں مدرس تھا، اس شخص کا قدپست، رنگ سیاہ اور ناک نقشہ بہت زیادہ غیر دلچسپ تھا، اُسکی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی، اس شکل و صورت کے عیب کو چھپانے کے لئے یا حسین بننے کی غلط فہمی کے باعث، وہ بہت زیادہ بن ٹھن کر رہتا تھا، چہرے کا رنگ تو پاؤڈر اور کریم سے سفید نہ ہو سکتا تھا، اور نہ مفلر اور نکٹائی، ناک نقشے کو درست کر سکتے تھے مگر ہاں بالوں کو اُس نے تیل، صابون اور دوسری چیزیں لگا کر، خوب چمکدار اور ملایم بنا لیا تھا، اور بالوں کی خوبصورتی دکھلانے کے لئے وہ اکثر ننگے سر رہتا تھا۔ اس شخص کے متعلق عجیب عجیب باتیں مشہور تھیں، کوئی کہتا تھا کہ اس کا باپ موچی تھا، جو آخر عمر میں عیسائی

عیسائی ہو گیا تھا، کوئی کہتا تھا کہ اسکی پرورش عیسائیوں کے مشن میں ہوئی ہے، کسی کا بیان تھا کہ یہ لامذہب سا آدمی ہے۔ عیسائیوں میں کہتا ہے عیسائی ہوں، اور مسلمانوں میں مسلمان بن جاتا ہے، ضعیدار صاحب سے لوگوں نے اس شخص کے مذہب کے متعلق دریافت کیا، تو انھوں نے بتایا کہ یہ شخص ہے تو مسلمان ہی، مگر اس کا بیان ہے کہ میں ابھی تک مذاہب کی تحقیق کر رہا ہوں، بہر حال مذہبی اعتبار سے اسکی زندگی ایک راز بنی ہوئی تھی، لوگ اس کو ماسٹر محمود کے نام سے پکارتے تھے، اور نام کے لحاظ سے لوگ اس کو بہر حال مسلمان سمجھتے تھے۔

اس قسم کے لوگ، جیسا یہ ماسٹر محمود تھا، اپنی پاکبازی، اور کردار کے تقدس کا رعب جمانے کے لئے ابتدا میں بہت ہی پارسائی بگھارتے ہیں۔ اور جب لوگوں کو ان کے چال چلن کی طرف سے اطمینان ہو جاتا ہے۔ تو پھر اسی اطمینان اور اعتماد کی آڑ لیکر وہ سب کچھ کر بیٹھتے ہیں جس کی کسی شریف تو کیا آوارہ انسان سے بھی توقع نہیں کی جا سکتی۔ شریف کے والد ضعیدار، اور انہی کے گھر کے دوسرے لوگوں نے بھی کئی مہینہ تک ماسٹر محمود کی چال ڈھال اور طور و طریق پر نظر رکھی، یہ ماسٹر نگاہوں کو پہچانتا اور تیوروں کو بھانپتا تھا، جب تک لوگ اس کو شک اور امتحان کی نظر سے دیکھتے رہے، اس نے انتہائی بناوٹ اور ریاکاری سے کام لیا، وہ لوگوں کے دکھانے کے لئے شریف کے ساتھ اس طرح پیش آتا تھا، جیسے یہ کچھ جانتا ہی نہیں ہے، اور اس کا کردار فرشتوں سے ملتا جلتا ہے۔ ماسٹر محمود جسے ہم آگے چل کر صرف "ماسٹر" کے نصف نام سے یاد کریں گے ضعیدار کے گھر میں اس قدر متانت اور سنجیدگی کے ساتھ داخل ہوتا، کہ لوگ خواہ مخواہ اس کا احترام و عقیدت کے ساتھ خیر مقدم کرتے۔ شریف دوڑی ہوئی آتی، اور اس کو آداب

کرتی، وہ نہایت ہی بے پرواہی کیساتھ آداب کا جواب دیتا، اور موسیقی سکھاتے وقت بہت ہی کم شریفہ کی طرف دیکھتا، اُس نے اپنے مصنوعی اور بناوٹی خشک انداز سے لوگوں کے دلوں میں یہ بات بٹھادی تھی کہ اُس کو شریفہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، اور وہ صرف بحیثیت اُستادِ موسیقی، اپنا فرض ادا کرنے کے لئے آتا ہے۔ ایک مرتبہ شریفہ ایک ٹھمری گارہی تھی، ضلعدار اور شریفہ کی ماں، صحن میں بیٹھے ہوئے تھے، شریفہ ٹھمری کے ایک بول پر مُسکرادی، اس پر ماسٹر نے خفا ہوکر کہا :۔

> شریفہ! گاتے وقت مُسکرایا نہیں کرتے، اور ہاں! گانے ہی پر کیا موقوف ہے، شریف لڑکیوں کو ہر وقت سنجیدہ اور متین بن کر رہنا چاہیئے۔

اس ریاکار ماسٹر کی باتیں سُن کر، بیچاری شریفہ سہم کر رہ گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اُس کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ کو مٹھی میں دبا کر بیجان کر دیا۔ شریفہ کے ماں، باپ، ماسٹر کی نصیحت کو سُن کر بہت خوش ہوئے، شریفہ کے سر سے ذرا بھی آنچل ڈھلک جاتا تو ماسٹر اس کو ٹوکتا، اور شریفہ کے ماں باپ کو اطمینان دلانے کے لئے اخلاق و آداب کا درس دیتا اور پاکیزگی اور شرافت کا مُبلغ بن کر پند و نصیحت کی باتیں سُناتا۔ شریفہ کے ماں باپ کو اول تو ماسٹر کی طرف سے پہلے ہی اطمینان تھا، دوسرے ماسٹر کے طرزِ عمل نے اُس اطمینان کو اور زیادہ راسخ اور قوی بنادیا، تھوڑا بہت وہم اور شبہ جو شمشاد کے کہنے سُننے اور توجہ دلانے سے پیدا ہوا تھا، وہ بھی جاتا رہا، اور نہ صرف جاتا رہا، بلکہ اعتماد و یقین کے قالب میں ڈھل گیا۔ ضلعدار اور اُسکی بیوی نے شریفہ اور ماسٹر پر سے نگرانی کو اُٹھالیا، وہ اب نہ تو اُنکی گفتگو سننے کی کوشش

کرتے تھے، اور نہ ماسٹر کی چال ڈھال پر نگاہ رکھتے تھے۔ شریفہ کا معلم موسیقی تو حرفوں کا بنا ہوا تھا، اُس نے بہت جلد اندازہ لگا لیا کہ شریفہ کے گھر والے اُس پر اعتماد کرتے ہیں، اور اعتماد کا جال بچھانے کے بعد، شکار پھانسنے کا وقت آگیا۔ اب وہ دونوں تنہائی میں گھنٹوں باتیں کرتے، اور موسیقی کے علاوہ دوسرے مباحث پر گفتگو ہوتی۔ پہلے شریفہ کسی بات کو تفصیل کیساتھ پوچھتی تھی، تو ماسٹر خفا ہو کر کہتا تھا کہ زیادہ بات چیت کرنا ٹھیک نہیں، اور اب وہ شریفہ کی پہل کئے بغیر ہی، گفتگو کو زیادہ سے زیادہ طول دینے کی کوشش کرتا۔ اس سے پہلے شریفہ کی مسکراہٹ پر ماسٹر روک ٹوک کرتا تھا، اور اب وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور بات میں بات پیدا کر کے ایسے فقرے کہتا کہ وہ نوجوان اور الھڑ لڑکی تھی، سنجیدہ اور متفکر بوڑھے آدمی کو اُن فقروں کو سُن کر ہنسی آجائے شریفہ ابتدا میں ماسٹر کی باتوں پر بڑے احتیاط کیساتھ مسکراتی، یہہ رنگ دیکھ کر ماسٹر نے اُس سے کہا کہ مسکراہٹ اور ہنسی سے تندرستی قایم رہتی ہے، ہنس مکھ چہرے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ آدمی کو ہر وقت خوش وخرم رہنا چاہیئے، اور کھانے کھیلنے اور ہنسنے بولنے کا یہی زمانہ تو ہے، اس زمانہ سے آدمی کو خوب فائدہ اُٹھانا چاہیئے، جوانی نام ہی ہنسی خوشی اور لطف و مسرت کا ہے۔

ماسٹر کی نئی قسم کی باتیں سُن کر، شریفہ کو بہت خوشی ہوئی وہ تو پہلے ہی سے سنجیدگی اور متانت کی قید وبند کو خیر باد کہنے کے لئے تلی ہوئی تھی، ماسٹر نے شریفہ کو سب سے پہلے بے تکلف کرنیکی کوشش کی، اور اس کوشش میں وہ بہت جلد کامیاب ہوگیا۔ جب شریفہ ہارمونیم بجاتی، تو ماسٹر اسکی انگلیوں کو پکڑ کر، پردوں پر رکھتا، اور اسطرح اُس نے شریفہ کے نازک اور لطیف جسم کو چھو کر، اپنے

خیال میں قریبی رابطہ پیدا کرلیا تھا، ماسٹر، اِس معصوم لڑکی کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا، اور ہر نئی منزل پر پہنچکر وہ اس بات کا اندازہ لگاتا تھا کہ اُس کی باتوں اور حرکتوں کو لڑکی کس حد تک گوارا کرتی ہے، جب ماسٹر کی ایک بے تکلفی اور چھیڑ چھاڑ کامیاب ہو جاتی، تو وہ کچھ اور آگے بڑھ جاتا۔ ہوسناکی کا زہر اپنا کام کر رہا تھا اور معصوم شریفہ اُس زہر کو شربت کے گھونٹ سمجھ کر پی رہی تھی، شریفہ پاکباز تھی اور ہوسناکی کے معاملات میں قطعاً ناتجربہ کار! اُسے کیا خبر تھی کہ ماسٹر اسکی انگلیوں کو چھوتے وقت اور کبھی کبھار اُس کے جسم کو ہلکا سا ٹہوکا دیتے ہوئے، کس قدر لُطف محسوس کرتا ہے، اور اُسکی آنکھیں کس درجہ ہوسناک اور وحشت آلود ہو جاتی ہیں، وہ تو یہہ سمجھتی تھی کہ یہہ سب کچھ صرف تھوڑی دیر کی ہنسی خوشی کیلئے کیا جا رہا ہے، وہ ہوسناکیوں کے اُن پھندوں سے قطعاً بے خبر تھی، جو اُس کے جذبات کے آس پاس لگائے جا رہے تھے۔

ماسٹر اب شریفہ کو ایسی ٹھمریاں اور غزلیں یاد کرانے لگا، جو عُریاں اور غیر سنجیدہ مضامین سے لبریز تھیں، شریفہ نے جب پہلی مرتبہ اس شعر کو گایا ہے کہ:۔

کوئی منہ چوم لے گا اِس نہیں پر
شکن رہ جائے گی باقی جبیں پر

تو اُس کے ماتھے پر پسینہ آگیا، اور اُس نے اِس شعر کو دہرائے بغیر دوسرا شعر شروع کر دیا۔

ارے۔ تم! آج اس قدر بیدلی کے ساتھ

کیوں گا رہی ہو، کہ ایک شعر کو دو مرتبہ بھی نہیں کہا،

اور آگے چل دیں ———— ماسٹر نے شریفہ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا

یہہ شعر ——— اونہہ — ! اچھا — تو۔

اس شعر کو پھر دہراؤں ———— شریفہ نے شرما کر جواب دیا

ہاں ! ہاں ! اس شعر کو ایک مرتبہ نہیں،

کئی مرتبہ دہراؤ، گانے میں شرمایا نہیں کرتے — !

کتنا اچھا شعر ہے اور تم اُس سے بے پروائی کے ساتھ

گذری جاتی ہو ———— ماسٹر بولا

شریفہ نے تھوڑی دیر گلے بازی کی، اور ہارمونیم پر گنگناتی رہی، ماسٹر نے بے صبری کیساتھ کہا کہ اُسی شعر کو دہراؤ —

ماسٹر صاحب ! یہہ شعر گاتے ہوئے، مجھے

نہ جانے کیوں شرم سی معلوم ہوتی ہے، اس شعر کو

رہنے دیجئیے میں اس غزل کے دوسرے شعر کئی کئی

مرتبہ گا کر سُنادونگی ———— شریفہ نے جواب دیا

شریفہ ! میں تمھارے حجاب ہی کو توڑنا چاہتا

ہوں، اس روشن اور مہذب زمانہ میں جبکہ راجوں

مہاراجوں اور شریفوں کی بہو، بیٹیاں، فلم کمپنیوں

میں داخل ہو کر، دُنیا میں نام پیدا کر رہی ہیں، تم کو

صرف ایک شعر گاتے ہوئے، شرم معلوم ہوتی ہے۔ یہیہ
تم بڑی بوڑھیوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔ اسی شعر کو
گاؤ، اور بہت دیر تک گاؤ ـــــ اسی شرم وحجاب
ہی نے تو مسلمانوں کو اس پست حالت میں پہنچا دیا ہے۔ ماسٹر ہارمونیم کو
چھوتے ہوئے بولا۔

شریفہ نے کئی بار کھانسا اور پھر ہمّت کر کے شعر کو گایا، پہلی مرتبہ تو اسکی آواز قدرے گھبرائی ہوئی اور دبی ہوئی نکلی، لیکن ماسٹر کے ابھارنے، شوق دلانے اور تعریف کرنے پر، اس نے اس شعر کو اس قدر مزے کیساتھ دہرایا، کہ وہ خود بھی لطف لینے لگی ـــــ ماسٹر نے چلتے وقت شریفہ کے گانے کی بہت تعریف کی، اس نے کہا کہ ایکی مرتبہ ضلع کی نمایش میں جو موسیقی کا جلسہ ہوگا، اس میں تم کو اول انعام دلاکر چھوڑونگا، اخباروں میں تمھارے فوٹو شایع ہوں گے، اور ہر جگہ تعریف ہوگی شریفہ کا دل باغ باغ ہوگیا، اور اس نے ماسٹر کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

ماسٹر کی نئی قسم کی باتوں سے شریفہ کو الجھن بھی ہوتی تھی۔ اور ساتھ ہی ہلکا سا لطف بھی محسوس کرتی تھی، اس کے جذبات کے پرسکون اور خاموش دریا میں ہلکی ہلکی موجیں کبھی کبھار پیدا ہوجاتی تھیں، اس جدید انقلابات کے داعیات اور محرکات اسکی سمجھ میں نہ آتے تھے، جب ماسٹر موسیقی کی تعلیم دیکر چلا جاتا تو وہ گھنٹوں اس کی ہم نشینی اور ہم جلیسی پر تبصرہ کرتی، بعض وقت اس کے ماتھے پر عتاب و نفرت کی شدت سے سلوٹیں ابھر آتیں، کبھی وہ اپنی انگلیوں کو دیکھ کر مسکرانے لگتی،

آور کبھی "ماسٹر صاحب نے آج کہا تھا کہ شریفہ تم بہت خوبصورت ہو" کہہ کر، آئینہ میں پہروں اپنے چہرے کو دیکھتی، اور خود ہی اپنے حسن پر تنقید کرتی :-

ماسٹر صاحب نے مجھے خوبصورت کہا، وہ تجربہ کار جہاندیدہ اور مجھ سے بہت زیادہ عقلمند ہیں، سینکڑوں ہزاروں عورت، مرد، اُن کی نظر سے گذرے ہونگے، اُن کا کہنا جھوٹ تھوڑی ہو سکتا ہے۔ اور یہ تو واقعہ ہے کہ میری جتنی ہمجولیاں ہیں اُن میں میرا رنگ سب سے زیادہ کھلتا ہوا ہے، حامدہ کی آنکھوں کی لوگ تعریف کرتے ہیں، مگر میرے رُخساروں کے تل اپنی جگہ لاجواب ہیں، شمیم کا دہانہ بہت چھوٹا ہے، مگر اُس تنگ دہانہ پر لانبی تھوڑی کتنی بدنما معلوم ہوتی ہے۔ میرا دہانہ اور تھوڑی دونوں متناسب ہیں۔

آج ماسٹر صاحب نے میری انگلیوں کو چھوتے ہوئے کہا تھا کہ تمہاری انگلیاں بہت ہی لطیف اور نازک ہیں، یہہ ماسٹر صاحب ! مجھے مغرور بنا کر چھوڑیں گے۔ مگر ہاں ! وہ بھی کیا کریں، آنکھوں سے جو کچھ دیکھتے ہیں، بیان کر دیتے ہیں، دلکی بات چھپانا بھی تو اچھا نہیں ہیں۔ بڑے مہربان اور خلیق ہیں میرے ماسٹر صاحب -- !

اچھا، یہہ ماسٹر صاحب ! کچھ دنوں سے زیادہ بے تکلفی کی باتیں کیوں کرنے لگے ہیں، پہلے تو وہ بالکل خاموش بیٹھے

رہا کرتے تھے، اور میرے ذرا سا مسکرا دینے پر اُن کو غصہ آجاتا،
تھا، مگر اب تو خود ہی چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں، آج تو انہوں نے
میرے رخسار کو ٹھوکا دیا، میری کلائی کو چھوا، اور میں اگر ہاتھوں
کو حایل نہ کر دیتی تو شاید وہ میری ران میں چٹکی لیکر چھوڑتے
— ماسٹر صاحب کی یہہ باتیں تو اچھی نہیں ہیں، مجھے ابا جان
سے نہیں تو، امی جان سے ان باتوں کا ضرور تذکرہ کر دینا
چاہیئے۔

لیکن — امی جان اور ابا جان تو ماسٹر صاحب سے
بہت زیادہ متاثر ہیں، ماسٹر صاحب کے مقابلہ میں، میری
بات کب چل سکیگی، مجھے اُلٹا جھوٹا بننا پڑیگا اور شرمندگی ہوگی
لاحول ولا قوۃ۔ ! یہہ میں کن بدگمانیوں اور خام خیالیوں
میں پھنس گئی ہوں، ماسٹر صاحب بہت نیک نفس اور شریف
ہیں۔ وہ یہہ سب باتیں میرے خوش کرنے کے لئے کرتے ہیں
اب تو انکی باتوں میں مجھے بھی لطف آنے لگا ہے۔

ماسٹر نے اندازہ لگایا کہ شریفہ ہر چھیڑ چھاڑ اور اقدام کو برداشت
کرتی جا رہی ہے، اب اُس نے تیزی کے ساتھ بڑھنا شروع کر دیا۔ وہ اب عشق
و محبت کے ذرا تیز قسم کے قصے، شریفہ کو سُنانا، انگریزی رسالوں کے عریاں اور
فحش فوٹو لا کر دکھانا اور بے تکلفی کی حد سے آگے بڑھ کر چھیڑ چھاڑ کرتا۔

لندن کے کسی مصور رسالہ کا ایک فوٹو، (دن ماسٹر) شریفہ

کہ دکھانے کے لئے لیکر آیا، اس تصویر میں یہہ دکھایا گیا تھا کہ ایک نوجوان عورت
جس کا سینہ کھُلا ہوا تھا، اور رانیں نصف سے زیادہ عریاں تھیں، ایک فوارے
کے پاس کھڑی ہوئی تھی، اور ایک مرد پیچھے سے اس کے شانوں کو سہلا رہا
تھا، عورت، مرد کے ہاتھوں کے لمس کو محسوس کر کے مُسکرا رہی تھی، اور اُسکی
آنکھوں سے ایک خاص قسم کی مستی اور ربودگی ٹپک رہی تھی۔

شریفہ۔ ! تم نے اس تصویر کو دیکھا
آرٹسٹ نے اپنا کمال ظاہر کر دیا ہے، ——— ماسٹر فوٹو کو شریفہ
کے سامنے رکھتے ہوئے بولا

جی۔ ہاں ! دیکھا، مگر ماسٹر صاحب، یہہ تو
بڑی بے شرمی کی بات معلوم ہوتی ہے، ایسی تصویریں
دیکھ کر میری تو نگاہیں آپ ہی آپ نیچے جھک جاتی ہیں۔ شریفہ نے میز کو ش
چھوتے ہوئے جواب دیا۔

شریفہ۔ ! تم بعض وقت غدر کے زمانہ کی عورتوں
جیسی باتیں کرنے لگتی ہو، زمانہ کہاں سے کہاں پہونچ
گیا ہے، اور تم ہو کہ شرم و حیا کے چکر میں پھنسی ہوئی ہو
اب شرم و حیا کا پُرانا دستور باقی نہیں رہا، اب تو
زندگی نام ہی مسرت، خوش فعلی اور ہنسنے بولنے کا ہے
اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اور زمانہ کے انقلابات
نے پرانے خیالات اور رجحانات کو بھی بدل دیا ہے،

اب تو عورتیں، مردوں کے دوش بدوش زندگی کی
منزل میں کام کر رہی ہیں کتنا ظلم ہے کہ مردوں کو تو ہنسنے
بولنے، تفریح کرنے اور لطف اٹھانے کی، ہر قسم کی آزادی
حاصل ہو، اور عورتیں بیچاری تنگ و تاریک مکانوں کی
چہار دیواریوں میں، قیدیوں کی طرح پڑی رہیں، اِسی
جابرانہ نظام اور ظالمانہ دستور کو، یورپ کی تہذیب
نے پارہ پارہ کر دیا ہے، اب عورت آزاد ہے، بالکل
آزاد! جذبات میں بھی آزاد اور خیالات میں بھی آزاد! ۔۔ ماسٹر نے انتہائی
سنجیدگی کیساتھ کہا۔

ماسٹر صاحب! آپ نے اچھا خاصہ لیکچر دے ڈالا

ہاں! صاحب مجھے یہ فوٹو پسند ہے، آرٹسٹ کے کمال
کا کیا کہنا، ہر چیز کو اِس قدر واضح طور پر دکھایا ہے کہ
کمال کی بیساختہ داد دینی پڑتی ہے۔

مگر یہ عورت مسکرا کیوں رہی ہیں، اِسے تو میرے
خیال میں ناخوش ہونا چاہیئے ———— شریفہ نے دریافت کیا

جب کوئی مرد، کسی عورت کو محبت اور پیار
کے ہاتھ سے چھوتا ہے تو عورت کو خوشی ہوتی ہے، اور
شریفہ ــ! اسی کا نام تو زندگی ہے، محبت کے بغیر زندگی
نہ صرف ادھوری بلکہ بے کیف اور روکھی پھیکی بنجاتی ہے،

دیکھو! فوٹو کو غور سے دیکھو۔ ! عورت کی آنکھوں کے
پپوٹے کیف و مسرت کے مارے کتنے بوجھل ہو گئے ہیں،
اس کی گردن میں کتنا لطیف خم پیدا ہو گیا ہے، ایسا معلوم
ہوتا ہے، جیسے مرد، اُس کے جسم کو نہیں چھُو رہا، بلکہ کوئی کیف
آور تیز سا انجکشن دے رہا ہے ــــــــــــ ماسٹر نے جواب دیا

ماسٹر نے شریفہ کو اب بہت زیادہ بے تکلف کر دیا تھا اور اب اس کی گفتگو کا موضوع عشقیہ افسانے اور اشعار رہتے تھے۔ شریفہ لاکھ پاکباز اور عصمت مآب سہی، لیکن اس کے پہلو میں جوان دل، جذبات سے لبریز دل اور ذراسی حرکت میں بے چین ہو جانے والا دل تھا، گھانس کے تنکے کتنے معصوم ہوتے ہیں، لیکن آگ کی گرمی پاتے ہی جل اُٹھتے ہیں، ساز کے پردوں کو چھیڑا جائے گا، تو وہ مترنم ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ عورت اور مرد میں جو جنسی اور صنفی کشش پائی جاتی ہے، وہ جب کبھی ایک دوسرے سے ٹکرائے گی، اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہے گی۔ پھر شریفہ تو جوانی کی اُس منزل میں تھی، جس منزل کے زمین و آسمان جذبات ہی جذبات ہوتے ہیں۔ اُسکو ایک غیر مرد کیساتھ تنہائی کی خوب لانبی فرصتیں اور اطمینان کے موقعے نصیب ہوتے تھے، موسیقی، شعر، اور عشقیہ افسانوں کا ماحول ملتا تھا، تو اُن رنگینیوں کی جھرمٹ میں اُس کو بہ ہر حال آزاد ہو جانا چاہیئے تھا۔ ماسٹر ایک بدصورت شخص تھا، اور اُس میں بظاہر کوئی دلکشی نہیں پائی جاتی تھی، لیکن وہ ناسمجھ لڑکی جو ماسٹر کے ہر اقدام اور ہر چھیڑ چھاڑ پر یہ محسوس کرتی تھی کہ اُس کے جذبات سے آہستہ آہستہ پردے اُٹھ رہے ہیں، اور اُس کو ایک نئی دنیا میں پہنچایا جا رہا ہے، ماسٹر کی خوبصورتی اور

کیا عمل ہوتا ہے بدصورتی پر غور کرتا ہی تو جذبات کا سیلاب آ بدصورتی اور خوبصورتی کی داہنی گلیاں اور بجلی لطیف و کثیف بدن میں نفوذ کر جاتی ہے

شریفہ کا باپ وہی ضلعدار، جیسے شمشاد نے شریفہ کے متعلق بہت کچھ سمجھایا تھا، زیادہ تر دورے پر رہتا تھا، وہ تو گھر کی باتوں سے بالکل غافل تھا،

شریفہ کی ماں نے جب دیکھا کہ ماسٹر اور شریفہ اب بہت زیادہ گھل مل کر بات چیت کرنے لگے ہیں، اور ماسٹر ہفتہ میں کئی کئی دن شہر سے آنے لگا ہے، اور تنہائی میں گھنٹوں بات چیت ہوتی ہے، تو اُسکا ماتھا ٹھنکا، اور اُس نے شریفہ کو باتوں باتوں میں ٹوکنا شروع کیا۔ مگر اب شریفہ ماں کی روک ٹوک کی کب پروا کرنے والی تھی، نصیحت، ہدایت اور روک ٹوک کا وقت گذر چکا تھا، شریفہ نے ماں کی باتوں کا سختی کیساتھ جواب دیا، اور غریب عورت کو سینکڑوں باتیں سُنا ڈالیں۔ شریفہ کی ماں کو ضلعدار کے دورے سے آنے کا انتظار تھا، ماسٹر سے کچھ کہنے سُننے کی اُس میں ہمت نہ تھی، اور پھر شریفہ کے تیور دیکھ کر، وہ ماسٹر سے اس سلسلہ میں کچھ کہنا خلافِ مصلحت بھی سمجھتی تھی۔

ایک دن ماسٹر اور شریفہ بالاخانہ پر بیٹھے ہوئے بات چیت کر رہے تھے، شریفہ کی ماں ماسٹر سے قدرے بدگمان ہو گئی تھی، وہ دبے پاؤں بالاخانہ پر اچانک پہونچ گئی، اور اُس نے دیکھا کہ شریفہ آرام کرسی پر لیٹی ہوئی ہے اور ماسٹر اُس کے بالوں کو سلجھاتے ہوئے کوئی ٹھمری گا رہا ہے، ماں کو دیکھ کر شریفہ گھبرائے ہوئے انداز میں کُرسی پر سنبھل کر بیٹھ گئی، اور ماسٹر بھی نہایت ہی پشیمانی اور توحش کے انداز میں بولا۔

"تشریف لائیے! بیٹھیے! آپ اس وقت کیسے چلے آئیں؟"

شریفہ کی ماں اس منظر کو دیکھ کر سکتہ میں آگئی، وہ بولنا چاہتی تھی، مگر جذبات کی شدت نے اُس کی زبان کو گنگ کر دیا تھا، وہ بُت کی طرح خاموش کھڑی تھی، لیکن اُسکے

بگڑے ہوئے تیور، غضبناک چہرہ، چشم آلود آنکھیں اور کپکپاتے ہوئے ہونٹ سب کچھ کہہ رہے تھے، اور اُسکی خاموشی جو کچھ کہہ رہی تھی، اُسے ماسٹر اور شریفہ اچھی طرح سُن رہے تھے اور نہ صرف سُن رہے تھے، بلکہ سمجھ بھی رہے تھے۔ بہت دیر تک خاموشی طاری رہی آخر شریفہ کی ماں نے ماسٹر کو مخاطب کر کے کہہ ہی دیا:۔

ماسٹر صاحب! یہہ موسیقی کی تعلیم اسی طرح دیجاتی ہے۔

اس ماسٹر نے کچی گولیاں تھوڑی کھیلی تھیں، جو بوڑھی عورت کے جواب پر سٹ پٹا جاتا، اُس نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا:۔

میں شریفہ کو ایک ٹھمری کی دُھن بتا رہا تھا، آپ گانے کے فن سے واقف نہیں ہیں، مالکوس کا انترہ بہت مشکل ہے

شریفہ کی ماں نے اِس پر جھلا کر کہا:۔

ہاں! یہہ تو ٹھیک ہے کہ میں گانے سے واقف نہیں ہوں، مگر اس تمھارے "مالکوس" کی دُھن میں یہہ قید بھی لگی ہوئی ہے، کہ اُستاد اپنے شاگرد کے بال سُلجھا کر، دُھن بتائے۔

اس کے جواب میں ماسٹر بولا:۔

قسم خدا کی مجھے اس کا بالکل خیال نہیں ہے کہ میں شریفہ کے بال سُلجھا رہا تھا، ہوسکتا ہے، اور اس کا ایک حد تک امکان ہے، کہ میں نے بے خیالی میں شریفہ کے بال ہاتھ میں لے لئے ہوں، یہہ موسیقی فن ہی ایسا ہے کہ تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔

شریفہ کی ماں، ماسٹر کے جواب پر کچھ دیر تک تاؤ کھاتی رہی، اُس کے بعد شریفہ

کی طرف مخاطب ہو کر بولی:۔

شریفہ کیا تجھے بھی ماسٹر صاحب کی طرح تن بدن کا ہوش نہ

نہ تھا،

شریفہ نے اس کے جواب میں کہا:۔

امی! آپ کے سر کی قسم، مجھے بالکل خبر نہیں کہ ماسٹر صاحب

نے میرے بال چھوئے تھے یا نہیں، میں تو ماسٹر صاحب کی آواز پر کان لگائے

ہوئے تھی۔ امی جان! آپ آج اس قسم کی باتیں کیوں کر رہی ہیں۔

شریفہ کی ماں، ان لاجواب باتوں کا کیا جواب دیتی، وہ خاموش ہو گئی، اور خاموش نہ ہوتی تو کیا کرتی، جوان لڑکی کے غیر مرد کے سامنے اور غیر مرد سے جوان لڑکی کے رُوبرو، بدگمانی اور شبہ کی بنا پر کچھ زیادہ کہنا سُننا بھی مصلحت کے خلاف تھا، اور جہاں تک زبانی باتوں کا تعلق تھا، اُس میں وہ کسی طرح شریفہ اور ماسٹر سے نہیں جیت سکتی تھی۔ شریفہ کی ماں یا خانہ پر رہی تھی کہ چھوکرے نے آ کر کہا کہ سید صاحب کے گھر کی عورتیں آپ سے ملنے کے لئے آئی ہیں، شریفہ کی ماں یہ سُن کر نیچے چلی گئی، اور ماسٹر اور شریفہ کو تنہائی کا ایک موقعہ مل گیا۔

امی نے دیکھ لیا تھا۔؟ ——— شریفہ نے ماسٹر سے

دریافت کیا۔

یقیناً دیکھ لیا تھا، ——— ماسٹر نے جواب دیا

تو اب کیا ہو گا، امی ایک دو مرتبہ دبی زبان سے

بدگمانی کا اظہار کر چکی ہیں، اور آج تو اُن کو پورا یقین ہو گیا

ہو گا ——— شریفہ نے گھبرا کر کہا۔

ہوگا کیا، یہی کہ ہم دونوں کی خوب رسوائی ہوگی،
تمہاری اماں، تمہارے ابا سے ذراسی بات کو، خوب نمک
مرچ لگا کر بیان کرینگی، اور پھر تمہارے اوپر ایک قیامت
نازل ہوگی، مجھ پر تو نہ تمہاری امی کا زور چل سکتا ہے، اور
نہ تمہارے ابا جان میرا کچھ بگاڑ سکتے ہیں، مگر تم تو اُن کی بیٹی
ہو، تم پر وہ سختی اور ظلم کا حق رکھتے ہیں ——— ماسٹر پتلون کی جیبوں
میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا

ماسٹر صاحب! خدا کے لئے مجھے رسوائی سے بچایئے! — شریفہ، ماسٹر کے
کوٹ کو تھام کر بولی۔

رسوائی تو ہو چکی، اب تو اس رسوائی کا جواب دینا ہے اسکے نتائج سے بچنا ہے،
اور وہاں تم اگر چاہو تو اُن مصیبتوں سے بچ سکتی ہو، جو اسی گھر میں، اور
اسی سرزمین پر تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔

یہہ سچ ہے کہ تمہارے باپ تم کو گھر سے نکال
نہیں دیں گے، لیکن تم ہر شخص کی نگاہ میں ذلیل بن کر
رہوگی، اور مجھے تو اُس برتاؤ کے تصور سے پسینہ آرہا ہے
جو تمہارے ساتھ کیا جائے گا ——— ماسٹر نے جواب دیا۔

ماسٹر صاحب! خدا کے لئے ایسی ترکیب
بتائیں، جو مجھے مشکلات سے بچا سکتی ہے، اور ہاں!
آپ نے یہہ کیا کہا کہ "تم اگر چاہو تو مصیبتوں سے بچ سکتی

ہو، ماسٹر صاحب! میرے ہاتھ میں کیا ہے! میں تو خود
آپکی مہربانی اور عنایت کی پناہ ڈھونڈھ رہی ہوں ـــ شریفہ گڑگڑا کر بولی
بتاؤں کہ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے؟ اور تم کیا کر سکتی ہو!
اچھا سُنو! ان تمام مصیبتوں اور ذلتوں سے بچنے کی یہی ایک تدبیر ہے
کہ تم اُس مکان کو اور اُن لوگوں کو خیرباد کہہ دو، جہاں تم پر مُصیبتیں
نازل ہوں گی، اور جو تم کو پاؤں کی جوتی بنا کر رکھیں گے۔
شریفہ! مجھے تمھارے ساتھ ہمدردی ہے، محبت ہے، اُنسیت
ہے، میں تم کو برباد دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں جس اسکول میں، ملازم ہوں،
وہاں میرے لئے بڑے اچھے مواقع ہیں، مگر تمھاری خاطر میں اُن تمام
خوش آیند مواقع کو چھوڑنے کے لئے تیار ہوں۔
کوئی شک نہیں کہ ماں باپ کی محبت اپنے اندر بڑا وزن رکھتی
ہے، اور اُن کی مفارقت بہت تکلیف دہ ہے، مگر مجبوریوں، ناگزیر
حالات اور واقعات کے تحت باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو چھوڑ دیتا ہے
دنیا میں ایسے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں، یہہ کوئی نئی بات
نہیں ہے، اور میں تو کہتا ہوں، جہاں چین ملے، آرام ملے، سکھہ کی
زندگی نصیب ہو، وہی جگہ رہنے کے قابل ہے، وہی میکہ ہے، وہی
سسرال ہے، اور وہی دوستوں، ہمجولیوں اور ساتھیوں کی بستی ہے،
ہنسی خوشی کی زندگی میں آدمی، ماں، باپ کی مفارقت کے
رنج کو ذرا سی دیر میں بھول جاتا ہے، اور تم تو عورت ہو، ایک ایک

دن تمہیں ماں باپ سے بہ ہر حال بچھڑنا ہے، تو پھر جب ایک بات ہوئے بغیر ٹل ہی نہیں سکتی، تو اُس کے لئے کسی خاص دن اور وقت کا انتظار ہی بیکار ہے، جب کہ بہت سی مصیبتیں پریشانیاں اور رسوائیاں بھی گھات میں ہوں۔

شریفہ ــ! میں تم کو بہت خوش رکھوں گا، تم میرے ساتھ بڑے لطف کی زندگی بسر کروگی، ہم تم یہاں سے سیدھے بمبئی چلیں گے وہاں میرے چچا امپریل بنک میں ملازم ہیں، اُن کے توسط سے کوئی معقول نوکری مل جائے گی، ـــــ شریفہ! تم نے بمبئی کا صرف نام سنا ہے، وہاں کے رنگین مناظر کو دیکھ کر تم لوٹ ہو جاؤ گی، یہہ یہہ تم اس نامعقول گاؤں میں پڑی ہوئی اپنی اوقات خراب کر رہی ہو۔ بمبئی میں سمندر کے کنارے جب ہم تم دونوں ٹہلا کریں گے، تو کتنا لطف آئے گا ــ!

شریفہ ــ! اُس خوشی اور اطمینان کا تصور کرو، جب تم بہترین موٹروں میں میرے دوش بدوش بیٹھ کر، سیر کیا کرو گی، جگمگاتے ہوٹلوں میں ہم تم دونوں ایک جگہ بیٹھ کر، پیا نو سُنا کریں گے، وہاں میں اور تم دونوں آزاد ہوں گے، نہ کوئی روکنے ٹوکنے والا ہوگا اور نہ کسی کے کہنے سُننے کا خوف! جہاں دل میں آئیگا، جائینگے اور جس سے چاہیں گے، ملیں گے کتنی پُرلطف اور اطمینان بخش ہوگی وہ زندگی ــ! اور ــ

تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیئے ——— شریفہ بے صبری کیساتھ بات کاٹتے ہوئے بولی

اتنا کچھ سمجھانیکے بعد بھی، تم پوچھتی ہو کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے، معلوم ہوتا ہے کہ خوف اور پریشانی نے تمھارے ہوش، حواس کو متاثر کر دیا ہے، میرا خیال نہیں بلکہ یقین ہے کہ تمھاری امّی، کسی نہ کسی آدمی کو تمھارے ابّا کے پاس بھیجکر، اُن کو ضرور بلا لیں گی، تمھاری امّی کے تیور بہت ہی خوفناک قسم کے تھے — !

شریفہ — ! دیکھو، تھوڑی تاخیر بھی، بہت سی مشکلات اور پریشانیوں کا باعث ہو گی، بس تم آج رات میں، جس طرح ہو سکے اس گھر کو چھوڑ دو، اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ میں بازار کے نکڑ والی گلی میں تم کو کھڑا ہوا ملوں گا، تم وہاں رات میں جب سب لوگ سو جائیں تو آجانا۔ میں سواری کا انتظام کر رکھوں گا سواری میں بیٹھ کر اسٹیشن پہونچ جائیں گے، اور وہاں سے سیدھا بمبئی کا ٹکٹ لیں گے دیکھو۔ ! گھبرانا نہیں، گھبراہٹ سے بنا بنایا کام بگڑ جاتا ہے، ذرا ہوشیاری اور اطمینان کیساتھ اس کام کو کرنا۔ اس قصبہ کی گلیوں میں تو رات کے نو بجے کے بعد سناٹا ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں گیارہ بجے کے بعد، تم بے دھڑک اپنے گھر سے روانہ ہو سکتی ہو، اُسوقت گھر کے آدمی بھی سب گہری نیند سوتے ہوں گے ——— ماسٹر، شریفہ کا ہاتھ مسکراتے ہوئے تھام کر بولا

بہت اچھا ـــــ میں ضرور ـــــ

شریفہ نے دو چار لفظ ہی کہے تھے کہ نیچے سے اُس کی ماں نے آواز دی اور شریفہ بالاخانہ سے اُتر کر صحن میں چلی گئی۔ ماسٹر، اپنی پوری اسکیم شریفہ کے سامنے پیش کر چکا تھا، اور شریفہ نے اُس اسکیم کی ایک ایک تجویز سے اتفاق کر لیا تھا، اس لئے ماسٹر بہت خوش تھا، اور مستقبل کا رنگین تصور اُس کے خیالات کو خوشی کا جھُولا جھُلا رہا تھا۔

فرار

ماسٹر، شریفہ کے مکان سے روانہ ہو کر، اپنے ایک جاننے والے کے یہاں پہونچا۔ اور دن چھُپے وہاں سے قصبہ کے باہر ایک دہرم شالہ میں چلا گیا۔ اس دہرم شالہ کی عمارت تو زیادہ بڑی نہ تھی، مگر اس کا باغ قیصر پور کی آبادی کو دیکھتے ہوئے۔ بہت لانبا چوڑا اور شاداب تھا۔ بے ترتیب روشوں پر مہندی اور کنیر کے پودے اور کیاریوں میں گیندے چنبیلی اور گلاب کے پھُول بہت بھلے معلوم ہوتے تھے، دھرم شالہ کے چبوترے پر دو چار سادھو ہر وقت بھبوت ملے بیٹھے رہتے تھے، دھرم شالہ کا چبوترہ چنڈو اور سُلفے کے پینے والوں کے لئے مشہور تھا، جب ماسٹر دھرم شالہ میں پھونچا ہے، تو ایک مشٹنڈا سادھو، سُلفے کے دم لگا رہا تھا، ماسٹر کو دیکھتے ہی، سادھو چلّا کر بولا:۔

ـــــ جا! کہہ دیا، کام ہو جائے گا، ضرور ہو جائے گا ـــــ

ـــــ آج ہی ہو جائے گا ـــــ

سادھوؤں اور فقیروں کے، اس قسم کے فقرے پیٹینٹ ہوتے ہیں، مگر جب آدمی کے دل میں چور ہوتا ہے، یا کوئی مشکل اور غرض درپیش ہوتی ہے، تو "فقیر کی بڑ" کو غیب کی آواز سمجھا جاتا ہے، ماسٹر سادھو کے پاس عقیدت کیساتھ بیٹھ گیا، ماسٹر کو اس بات کا یقین ہوگیا تھا، کہ یہہ سادھو سچ مچ خدا رسیدہ ہے، اور دل کی بات چہرہ پر نظر ڈالتے ہی بتا دیتا ہے، سادھو جب خوب سُلفے کے دھوئیں اُڑا چکا، تو اُس نے چلم الاؤ کے کنارے پر رکھہ دی، اور انگوچھے سے اپنی اُلجھی ہوئی ڈاڑھی کو پونچھنے لگا، ماسٹر نے جیب میں سے ایک روپیہ نکال کر، سادھو کی "بارگاہِ بے نیاز" میں پیش کیا، اور سادہو نے یہہ کہتے ہوئے کہ بچہ! اس کی کیا ضرورت ہے، روپیہ لیلیا۔

شریفہ نے گھر سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا، گھر کے کسی کام میں اُس کی طبیعت نہ لگتی تھی، اور اُس پر ایک عجیب قسم کی وحشت اور بدحواسی طاری تھی، شریفہ کی ماں نے باہر سے آئی ہوئی عورتوں کے کیواسطے، پان بنانے کے لئے کہا تو شریفہ نے بے خیالی اور وحشت میں سروتہ سے اُنگلی کاٹ لی، اور پانوں کا کپڑا لہو میں تر بتر ہوگیا، ایک عورت نے اپنے رومال سے دھجی پھاڑی، اور پانی میں بھگو کر، شریفہ کی انگلی پر باندھ دی۔ عورتوں کے لئے چائے بنائی، تو بعض پیالیوں میں پانچ پانچ چھ چھ چمچے شکر جھونک دی، اور بعض پیالیوں کو شکر کے چمچہ سے بھی نہ چھوا۔ عورتوں میں چائے پر بہت مذاق رہا، اور سب نے اس کو شریفہ کے لڑکپن پر محمول کیا۔

شریفہ کی چال میں بھی ایک خاص قسم کی تبدیلی پیدا ہوگئی تھی، وہ اس طرح چلتی تھی، جیسے کوئی اس کے تلوؤں میں گدگدی کر رہا ہے، اور وہ قوت کیساتھ زمین پر پیر نہیں رکھہ سکتی، شریفہ کی ماں، بیٹی کی اس تبدیلی اور وحشت کو خوب اچھی طرح

محسوس کر رہی تھی، اور اُس کا خیال نہیں بلکہ یقین تھا، کہ آج کے واقعہ نے شریفہ کو بہت متاثر کیا ہے، اسی کے سبب شریفہ سے ایسی مضطربانہ حرکتیں ظہور میں آرہی ہیں، تو ایسی صورت میں، جبکہ شریفہ کی ماں کے خیال میں، شریفہ خود ہی حد سے زیادہ نادم اور پشیمان ہو رہی تھی، اس کو کسی بات پر ٹوکنا، یا کچھ کہنا سُننا ٹھیک نہ تھا اُس غریب کو کیا معلوم تھا کہ اُس کے جگر کا ٹکڑا آج بغاوت پر آمادہ ہے، اور موسیقی کے سُریلے نغمے اپنا اثر دکھا رہے ہیں۔

شریفہ نے رات میں کچھ یوں ہی سا کھانا کھایا، وہ بہت سویرے بستر پر لیٹ گئی اور بہت دیر تک آنکھیں بند کئے پڑی رہی، ماں، باپ کی جدائی کا تخیل رہ رہ کر اُسکے سنگین ارادے میں تزلزل پیدا کرتا تھا، لیکن جب ماسٹر کی کہی ہوئی باتیں یاد آتی تھیں، تو وہ اپنے عزم میں غیر معمولی قوت محسوس کرتی تھی۔ اُس نے ماسٹر کیساتھ فرار ہونے کا پلنگ پر لیٹے لیٹے اگرچہ فیصلہ کر لیا تھا" مگر ماں باپ کی جُدائی اور نئی زندگی کے عواقب و نتائج کے تصورات اب بھی اُس کے تفکر کا دامن تھامے ہوئے تھے، اُسکے خیالات اسی کشمکش کے طوفان میں جھکولے کھا رہے تھے کہ گھڑی نے ٹن ٹن کرنا شروع کیا، اور جب گھنٹہ کی آواز بند ہوئی ہے، تو وہ آہستہ سے بولی:۔

"دس بج گئے۔ ! یعنی گیارہ بجنے میں"

"صرف ایک گھنٹہ باقی ہے۔

اُس نے چادر کو چہرے سے اُٹھا کر دیکھا تو سارے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا، اُسکی ماں قریب کے کمرے میں خراٹے بھر رہی تھی، ماما کا چھوٹا بچہ، برآمدے میں ہُمک رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ ماں کا دُودھ پی رہا ہے۔ شریفہ پلنگ

پلنگ سے اُٹھی، اور اُس نے دبے پاؤں، مکان کا ایک چکر لگایا، سب لوگ گہری نیند سو رہے تھے، اُس طرف سے اطمینان ہو گیا، تو اُس نے اپنے کمرے میں جا کر، اپنے ٹرنک کو کھولا، اور لباس تبدیل کیا، اُس نے فرار کا پکا ارادہ کر لیا تھا، اور اِس ارادے نے اُس میں ایک قوت سی پیدا کر دی تھی، مگر اس بالکل نئے تجربہ نے اس کو غیر محسوس طور پر متوحش بنا دیا تھا، اسی توحش اور گھبراہٹ کا اثر تھا کہ کئی منٹ میں وہ قمیص پہن سکی، ایک آستین پہنتی تھی، تو دوسری آستین گھبراہٹ میں نہ ملتی تھی، اور جب دونوں آستین، باہوں میں آگئیں، تو سر گریبان میں پھنس گیا، شریفہ کی ماں کا کمرہ بالکل قریب تھا، اس لئے کپڑوں کی سرسراہٹ اور سانس کی تیزی کو روکنے اور چھپانے کی بھی اُسے کوشش کرنا پڑ رہی تھی۔ اُسکی ماں نے نیند ہی میں کروٹ لی اور کروٹ بدلتے میں، اُسکی کلائی کا کڑا، مسہری کی پٹی سے ٹکرایا، شریفہ سمجھی کہ اُسکی ماں جاگ پڑی، وہ چور کی طرح سہم کر، اُسی حالت میں پلنگ پر لیٹ گئی، اور کئی منٹ تک سانس کو روکے ہوئے خاموش پڑی رہی، اسکی ماں تو خوب گہری نیند سو رہی تھی، اُس کے خراٹوں کی آواز سُن کر، شریفہ پھر اُٹھی اور جلدی سے ساڑی بدل کر بُرقعہ پہن لیا۔ کمرے سے چلتے وقت اُس نے اپنی ماں کے کمرے میں جھانک کر دیکھا، شریفہ کی ماں کا چہرہ آدھا چہرہ کھُلا ہوا تھا، ماں کے چہرے کو دیکھ کر اُس کی پلکیں نم آلود ہو گئیں ماں کی محبت نے پاؤں کو بھاری بنا دیا، مگر فرار کے بعد کے رنگین اور خوش آیند مستقبل نے اس کے دبے ہوئے جذبہ کو تیزی کیساتھ اُبھارا۔ اور وہ ماں کے چہرے پر آخری اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر، کمرے سے باہر آگئی۔ ماما، بچہ کو سینہ سے چمٹائے ہوئے۔ برآمدے میں سو رہی تھی، اور اُس کے اُلجھے ہوئے بال خاک پر بکھرے ہوئے تھے، وہ صحن میں پہونچی

چاند کی بارہویں تاریخ تھی صحن میں دودھ سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی، صحن کی ایک ایک چیز خوب صاف دکھائی دیتی تھی، وہ صحن سے گذر کر ڈیوڑھی میں آئی، اور اس آخری منزل میں آکر وہ ٹھٹک گئی، شریفہ کے باپ کا وفادار ملازم کمال خاں ڈیوڑھی میں سو رہا تھا۔ کمال خاں پر ضلعدار کو بہت زیادہ اعتماد تھا، اور وہ اپنے گھر کو کمال خاں پر چھوڑ کر دورے پر ہفتوں اور مہینوں باہر رہا کرتا تھا۔ کمال خاں کی عمر ساٹھ کے قریب تھی، مگر اس بڑھاپے میں بھی، اچھے اچھے جوانوں کو شرماتا تھا، کسرتی جسم، طباق سا چہرہ، گھنی ڈاڑھی، خوب بھرے ہوئے شانے، ڈھیلا کرتہ پہن کر اور سر پر منڈاسہ باندھ کر، اچھا خاصا دیو معلوم ہوتا تھا، کمال خاں کا پلنگ صدر دروازے کے قریب بچھا ہوا تھا، اور پلنگ کی پٹی سے، لانبا سا لٹھ رکھا ہوا تھا، طاق میں مٹی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، اور پچھم کی طرف کے کونے میں بکریاں بندھی ہوئی تھیں، شریفہ برقعہ میں لپٹی ہوئی تھی، تھوڑا سا چہرہ کھلا ہوا تھا، بکریوں نے اس کو دیکھ کر، چمکنا شروع کیا، اور کھروں کو زمین پر مارنے لگیں، کمال خاں نے " اع، عا" کرتے ہوئے، اس طرف کروٹ لی، جس طرف شریفہ کھڑی ہوئی تھی، شریفہ ڈر کے مارے، دیوار سے چمٹ کر کھڑی ہوگئی، کمال خاں کا لٹھ، اور اُس کا چہرہ شریفہ کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں بکریوں کے کھروں کی آواز سُن کر کمال خاں چونک نہ اُٹھے، اُس نے ہمّت کر کے چراغ کو گُل کر دیا، اور ڈیوڑھی میں یکایک اندھیرا پھیل گیا۔

شریفہ دبے پاؤں، دروازے پر پھونچی، اور بہت ہی آہستگی کیساتھ دروازہ کھولا، اور وہ تیزی کیساتھ مکان کے باہر ہوگئی، قیصر پور کی گلیوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا، کہیں سے ایک ہلکی سی آواز بھی سُنائی نہ دیتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے

اس قصبہ کے رہنے والوں کو کسی نے کوئی تیز سا نشہ پلا کر، غفلت کی نیند سُلا دیا ہو، شریفہ کو گلیوں میں دو چار جگہ کتّے ملے، جو حسب عادت زور زور سے بھونکنے لگے، شریفہ کا سینہ خوف کے مارے اوپر نیچے ہو رہا تھا، اور اُس کے پاؤں لڑکھڑاتے ہوئے پڑ رہے تھے۔ تھوڑی سی دیر میں وہ اُس نکڑ پر پہونچی جہاں ماسٹر اُس کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔ چاندنی میں خوب دور تک کی چیز دکھائی دیتی تھی، ماسٹر نے شریفہ کو بہت دور سے پہچان لیا، اور آگے بڑھ کر، شریفہ کے پاس پہونچا، اور انتہائی ہمدردی کے لہجہ میں بولا:۔

شریفہ! تم آگئیں — میں تو نو بجے سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

شریفہ نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا:۔

آپ کو زبان دے چکی تھی، بھلا کیسے نہ آتی —— !

ماسٹر نے، شریفہ کی گھبراہٹ کو دور کرنے کے لئے کہا کہ اب گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، میں نے سب کچھ انتظام کر لیا ہے، بس ذرا اسٹیشن روڈ تک پہونچنے کی دیر ہے، پھر ہم ہر خوف اور خطرے سے آزاد ہیں۔ اسٹیشن روڈ، بازار کے نکڑ سے دو فرلانگ کے فاصلہ پر تھی، معمولی رفتار سے صرف چند منٹ کا راستہ تھا، لیکن گاؤں اور قصبہ کے کتّے بھی، شہر کے کتوں کے مقابلہ میں ذرا "باحمیت" اور "جنگجویانہ اسپرٹ" کے ہوتے ہیں، کہ ذرا پتہ کھڑکا، اور اُنھوں نے ایڑی، چوٹی کا زور لگا کر "بھوں، بھوں" کرنا شروع کر دیا۔ ایک کتّے نے ذرا "عوعو" کیا کہ دوسرا کتّا بھی اپنے

بھائی کی ہمدردی میں اُس کا ہم نوا بن گیا' اب یہہ سلسلہ قایم ہوتا چلا گیا' یہاں تک کہ گاؤں کے قریب قریب تمام کُتّے ایک ہی آواز اور لہجہ میں بولنے لگے' اور بعض بعض کُتّا تو اس قوت کیساتھ چلّاتا ہے' گویا کہ" سارے جہاں کا درد' اسی کے جگر میں بھرا ہوا ہے۔

بعض کمزور اور سنجیدہ قسم کے کُتّے' اپنے بھائی بندوں کی ہمدردی میں بس ذرا ایک آدہ مرتبہ "عف" کرکے رہ جاتے ہیں۔ مگر بعض پتلی دُبلی کُتیاں' اس زور اور قوت کیساتھ بھونکتی ہیں' کہ انگریزی کونسلوں اور اسمبلیوں کے لڑاکو ارکان بھی' ان کو دیکھیں تو شرما جائیں۔ گاؤں اور قصبوں کی راتوں کا سکوت یہی کتے توڑتے رہتے ہیں' اور ان ہی آوازوں چلت' پھرت سے معلوم ہوتا ہے' کہ یہاں زندہ لوگ بستے ہیں' ماسٹر اور شریفہ کو دیکھ کر' کتوں نے حشر برپا کر دیا' ماسٹر کُتوں کو بار بار دہمکاتا تھا' مگر کُتّے کہیں ان دہمکیوں کی پرواکرنیوالے تھے' وہ ان دونوں کا برابر تعاقب کئے چلے جارہے تھے' جہاں ایک گلی ختم ہوئی تو' اس گلی کے کُتّے' دوسری گلی کے کُتوں کے چارج میں ماسٹر اور شریفہ کو دیکر' رخصت ہوگئے" چارج" اور "ڈسچارج" کا سلسلہ اُس وقت تک باقی رہا' جب تک یہہ دونوں تانگہ میں سوار نہ ہوگئے۔ کُتوں کے اس بے ہنگام دخل درمعقولات کے باعث' ماسٹر اور شریفہ' بہت دیر میں اسٹیشن روڈ پہونچے۔ تانگہ والا کوچ پر بیٹھا ہوا' چلم پی رہا تھا' ماسٹر کو دیکھتے ہی وہ تانگہ سے اُترا' شریفہ اور ماسٹر تانگے میں سوار ہوئے' تانگہ والے نے لگام کو جُنبش دی' اور گھوڑا فراٹے بھرنے لگا۔

اسٹیشن روڈ کے دونوں طرف سایہ دار درخت تھے' جن کی گھنی چھاؤں نے سڑک کو چاندنی کے اُجالے سے محروم کر دیا تھا' ماسٹر اور شریفہ پچھلی سیٹ پر

خاموش بیٹھے ہوئے تھے، تانگہ والا راستہ کاٹنے کے لئے، جو کچھ اُسے یاد تھا مزے لے لیکر گا رہا تھا۔ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز اور تانگے والے کی غزلیں اور ٹھمریاں مل جُل کر، سناٹے کو چونکا رہی تھیں، یہہ دونوں بالکل خاموش تھے، ایک مرتبہ شریفہ کی زبان سے چند لفظ ادا ہوئے کہ:۔

—— ماسٹر صاحب! ذرا سنبھل کر بیٹھئے۔ دیکھئے

—— تو ——————————

ہوسناکی اور بے صبری ملی جُلی کیفیتوں کا نام ہے، ہوس پرست انسان بڑا ہی جلد باز ہوتا ہے، اور یہی "بے صبری" اُس کے بہت سے بھیدوں کو طشت از بام اور بہت سی اسکیموں کو تباہ کر دیتی ہے۔ ماسٹر بھی، ان لمحات سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا، اور وہ سمجھتا تھا کہ شریفہ اُس کے قبضہ میں ہے، اور وہ اُس پر ہر طرح کا حق رکھتا ہے، شریفہ کے اس جُملہ پر، ماسٹر کھسیانا ہو کر کہنے لگا:۔

"شریفہ! مجھے نیند کے جھونٹے آرہے ہیں"

"شاید بے خیالی میں" تمھارے شانے میں نے"

"چھولئے ——

تھوڑی دیر تک تو ماسٹر خاموش بیٹھا رہا، لیکن ہوسناکی، کہیں جذبات کو نچلا تھوڑی بیٹھنے دیتی ہے، وہ آہستہ آہستہ شریفہ کے قریب کھسک کر آگیا اور اپنے جسم کو، شریفہ کے بدن کے بالکل قریب لے آیا، شریفہ نے اپنے بدن کو بہت کچھ چُرایا، اور سکیڑا، مگر تانگہ میں گنجائش ہی کتنی ہوتی ہے، ماسٹر اس کی طرف کھسکتا ہوا چلا آرہا تھا، اور اُس کی سانس خوب تیزی کیساتھ چل رہی تھی۔

ماسٹر صاحب! آپ یہہ کیا کر رہے ہیں،
میں آپ کو ایک مرتبہ ٹوک چکی ہوں ـــــــــ شریفہ نے کہا۔

شریفہ! تم آج اکھڑی ہوئی سی باتیں کر رہی ہو
تم اتنی شرماتی کیوں ہو، یہاں دیکھنے والا کون
ہے، تانگہ والا تو اپنے گانے میں مصروف ہے ـــــ ماسٹر نے جواب دیا۔

یہاں دیکھنے والا کون ہے" اس سے آپ کا
مطلب کیا ہے، یہہ تو آپ آج، نئی قسم کی باتیں کر رہے ہیں ـــ شریفہ، تانگے
کے ڈنڈے پر ہاتھ کا زور
دیتے ہوئے بولی۔

باتیں تو نئی نہیں ہیں، آج تم ہی کچھ نئی بن گئی
ہو، ان ہی باتوں کے لئے تو میں تم کو اُن بندھنوں اور
پابندیوں سے چھڑا کر لایا ہوں، اب تو ہم کو ایک دوسرے
کیساتھ، انتہائی بے تکلفی کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔
اور ہاں! جو ہاتھ تمہارے بالوں کو چھُو چکے
ہیں، وہ تمہارے رُخسار چھُونے کا بھی حق رکھتے ہیں،
اس جُراءت اور جسارت کی تخلیق میں تم نے بڑی حد تک
حصہ لیا ہے، شاید! تم خوف اور گھبراہٹ کے سبب ایسا
کر رہی ہو، لیکن ڈر، گھبراہٹ اور احتیاط کی سرحد
ختم ہوگئی، اب تو تم "تبادلۂ جذبات" کی آغوش میں

ہو، وہاں، جہاں مرد اور عورت، بالکل آزاد ہوتے ہیں۔ ماسٹر نے شریفہ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا

ماسٹر کی دست درازی پر، شریفہ کا ماتھا ٹھنکا، غصہ اور غیرت کے اثر سے اُس کا سینہ اوپر، نیچے ہونے لگا، تھوڑی دیر میں اسٹیشن آگیا، اور دونوں تانگہ سے اتر کر پلیٹ فارم پر پہونچے۔ قیصر لوپہ روڈ اسٹیشن، بہت ہی چھوٹا اسٹیشن تھا، دفتر کے دو کمرے، تیسرے درجہ کا چھوٹا سا مسافر خانہ، بابوؤں اور ادنیٰ ملازمین کے رہنے کے لئے چند کوارٹر، بس یہی اسٹیشن کی کائنات تھی۔ اسٹیشن پر سناٹا چھایا ہوا تھا، دو چار مسافر پلیٹ فارم پر پڑے ہوئے سو رہے تھے، حلوائی کی دوکان پر جو اسٹیشن ہی کے کمپاونڈ میں تھی، ٹمٹماتا ہوا چراغ جل رہا تھا اور اسٹیشن کا پہریدار حلوائی کی دوکان کی بھٹی پر بیٹھ کر حقہ پی رہا تھا۔ گاڑی کے آنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔

ماسٹر نے شریفہ کا ہاتھ تھام کر کہا کہ چلو، پلیٹ فارم کے کھلے ہوئے حصہ پر بیٹھیں گے ابھی گاڑی کے آنے میں ٹایم ٹیبل کے لحاظ سے ایک گھنٹہ باقی ہے، اور اس لاین پر تو گاڑیاں عام طور پر لیٹ ہو جاتی ہیں۔ شریفہ نے کہا کہ مجھے تو وہاں تنہائی میں ڈر لگیگا، یہ اسٹیشن تو بالکل جنگل میں واقع ہے، جس طرف آپ بیٹھنے کے لئے کہہ رہے ہیں، اُس طرف جنگل ہی جنگل ہے، آپ دیکھتے نہیں ہیں، کتنی گھنی جھاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں، پچھلی برسات کا قصہ ہے کہ ایک ساہوکار کو، اس اسٹیشن پر ڈاکوؤں نے لوٹ لیا، اس اسٹیشن کو تو میں ہر وقت خطرے میں سمجھتی ہوں، اب اس وقت مسافر اور دوکاندار، سب مل ملا کر مشکل سے پندرہ ہونگے، وہ بھی سب نہتے، اب ایسے میں اگر تین چار آدمی بھی چھوٹی بندوق یا پستول لیکر آجائیں تو کس کی ہمت ہے جو اُن کا مقابلہ کر سکے۔ ماسٹر اصرار کرتا رہا

اور شریفہ اس کی ہر بات کو ٹالتی رہی، اور وہ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کے سامنے دری بچھاکر بیٹھ گئی۔ کوئی ایک گھنٹہ کے بعد، تارگھر میں گھنٹی بجی، اور پہریدار نے "رات بابو" کو جو دفتر کی میز پر سو رہا تھا، جگایا کہ تار کی گھنٹی بج رہی ہے۔ بابو ہتھیلیوں سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھا، اور اسی حالت میں کہ اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی، اور گریبان کھلا ہوا تھا، اس نے تار کے آلہ پر ہاتھ رکھہ دیا، اور کچھ دیر بعد پرزور آواز سے بولا:

"گاڑی چھوڑ دی گئی، گھنٹی بجاؤ"

پہریدار نے گھنٹی بجائی، مسافر گھبرا کر اٹھے، اور ذرا سی دیر میں ٹکٹ لیکر پلیٹ فارم پر آگئے۔ ماسٹر نے اپنا اور شریفہ کا بھی ٹکٹ لیا، اور یہہ دونوں سگنل کے قریب کی بنچ پر اپنا مختصر سا سامان لیکر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں گاڑی آگئی اور یہہ دونوں ایک ڈبہ میں سوار ہو گئے۔ ماسٹر نے شریفہ کے تیور دیکھہ کر، چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ بالکل بند کر دیا تھا، اور وہ اپنے دل میں اپنی عجلت اور بے صبری پر خود پشیمان تھا۔

شریفہ راستے بھر خاموش بیٹھی رہی، ماسٹر نے بھی بات چیت کرنا مناسب نہ سمجھا، کوئی ڈیڑھ گھنٹہ میں عظیم گنج جنکشن آگیا، اور مسافروں نے گاڑی کو خالی کر دیا۔ قیصر پور کا ضلع عظیم گنج تھا، اور اسی جنکشن سے بمبئی کے لئے گاڑی ملتی تھی۔ اس جنکشن سے دو لائینیں جاتی تھیں، جنکشن کی عمارت تو معمولی تھی لیکن مسافروں کا ہر وقت ہجوم رہتا تھا۔ شریفہ اور ماسٹر، ٹرین سے اتر کر تیسرے درجہ کے مسافر خانہ میں پہونچے۔ مسافر خانہ،

اسٹیشن کی اصل عمارت سے چند قدم کے فاصلہ پر تھا' اس عمارت میں کافی گنجایش تھی'
دو ہزار سے کچھ زائد مسافر' بہ یک وقت آرام کیساتھ بیٹھ اُٹھ سکتے تھے۔ مسافرخانے کے
ایک حصہ میں پان' سگرٹ میوے اور مٹھائی کی دوکانیں تھیں' اور بالکل بیچ میں تیسرے
درجہ کا ٹکٹ گھر تھا۔ اس جنکشن پر قیصرپور کے آنے جانے والے' ہر ٹرین کے وقت
موجود رہتے تھے' اس لئے ماسٹر نے شریفہ کو زنانہ ویٹنگ روم میں بھیجدیا۔

جب شریفہ اور ماسٹر عظیم گنج جنکشن پر پہونچے ہیں تو صبح کے ساڑھے چار کا
وقت تھا'

بمبئی کے لئے دن کے نو بجے ایکسپریس ملتا تھا' اور قیصرپور روڈ اسٹیشن کو ساڑھے
چھ بجے گاڑی جاتی تھی' شمشاد کلکٹری کچہری میں کسی کام سے آیا ہوا تھا' اور اتفاق کی
بات کہ شریفہ کا باپ ضلعدار بھی صبح کی ٹرین سے طویل دورے کے بعد' قیصرپور کو واپس
ہو رہا تھا' شمشاد سرائے سے' بہت سویرے اُٹھ کر' اسٹیشن چلا آیا' اور یہیں آکر اُس نے
صبح کی نماز ادا کی' نماز پڑھنے کے بعد' وہ بکنگ آفس کے سامنے بینچ پر بیٹھ گیا۔

ریلوے مسافرخانے حقیقت یہہ ہے کہ "نفسیات کی زندہ تاریخیں" ہیں'
مختلف طبایع اور کردار کے لوگ بہ یک وقت نظر آتے ہیں۔ اور اگر کوئی حساس اور
زندہ دل آدمی' مسافروں کی حرکات و سکنات کا لبغور مطالعہ کرے' تو کاغذوں پر لکھے
ہوئے افسانوں سے بہت زیادہ لطف حاصل ہو۔ مسافرخانوں کے صبح و شام اور
راتیں افسانوں اور ناولوں کے نئے نئے خاکے اور نظموں کے موضوع پیش کرتی رہتی
ہیں لیکن بہت کم لوگ اس زندگی اور چہل پہل فایدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بات
یہہ ہے کہ اول تو ہر مسافر عام نفسیات کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا' دوسرے جو

لوگ ذرا بلند نظر ہوتے ہیں، وہ مسافروں کیساتھ گھل مل کر "مسافر" بن جاتے ہیں، مسافر خانوں کی زندگی کا وہی شخص صحیح لطف اٹھا سکتا ہے، جو صرف تماشائی کی حیثیت سے، لوگوں کو پڑھنے کی کوشش کرے، بالکل فلموں کے دیکھنے والوں کی طرح۔ اگر آدمی مسافر خانوں کے اسٹیج پر آکر خود بھی ایکٹر بن گیا، تو پھر وہ "تماشے" کا لطف نہیں اٹھا سکتا آدمی ایک ہی وقت میں اداکار اور تماشائی نہیں بن سکتا۔

عظیم گنج جنکشن پر بڑی چہل پہل نظر آرہی تھی، رات کا اندھیرا صبح کی سپیدی میں گم ہو چکا تھا، اور سورج کی بیقرار کرنیں، ٹین کے شیڈ اور درختوں کے پتوں کو چوم رہی تھیں۔ ریلوے ملازمین نے، گیس کے ہنڈوں اور لالٹینوں کو گل کر دیا تھا، مسافر جلدی جلدی ہاتھ منہ دہو رہے تھے، مٹھائی کی دوکانوں پر کتنے دونے چاٹ رہے تھے اور حلوائی پھرتی کیساتھ گرم گرم جلبیوں کی تیاری میں مصروف تھے، پنواڑی اپنی تھالیوں کو صاف کر کے، پان اور سگرٹ سلیقہ کیساتھ رکھ رہے تھے، بعض لوگ ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر، اس طرح کھڑے ہوئے تھے، کہ ایک ہاتھ میں لوٹا تھا، اور دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں ٹکٹ کے پیسے تھے، ٹرین کے آنے میں ابھی دیر تھی، مگر یہ لوگ بے تاب ہو ہو کر کہتے تھے

بابوجی! ٹکٹ دیجئے — گاڑی آنیوالی ہے،

اُٹھیے، آپ تو گھوڑے بیچ کر سوئے ہیں —

ہم آپکی کاہلی کی صاحب کو رپورٹ کر دیں گے، —

خونچے والے اپنے مخصوص انداز میں آوازیں لگا رہے تھے: —

گرم جلیبیاں، دال موٹھ، کچالو ——————

گنڈیریاں سستی کر دیں، تازہ میوہ، بادام کا حلوہ! —

علی گڑھ کے بسکٹ، متھرا کا کھرچن ــــــ

شمشاد بینچ پر بیٹھا ہوا اس منظر سے لطف اُٹھا رہا تھا، اس پورے مجمع میں شاید ہی شخص اس تماشے کو دیکھ رہا تھا، اور سب تو اداکاری میں مصروف تھے ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر جو مسافر کھڑے ہوئے تھے، اُن میں سے ایک مُسافر کا پیر کُتے پر پڑ گیا کُتا اُٹھ کر بھاگا، اور مُسافر دھڑام سے فرش پر گر پڑا، سب لوگ ہنسنے لگے، تو شمشاد اس طرف متوجہ ہو گیا، شمشاد نے دیکھا کہ ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے قریب، ضلعدار کی لڑکی شریفہ کو موسیقی سکھانے والا ماسٹر کھڑا ہوا، ٹائم ٹیبل دیکھ رہا ہے، شمشاد نے اُس کو آواز دی مگر وہ اس قدر محو تھا کہ شمشاد کی آواز کو نہ سُن سکا، شمشاد اُس کے پاس اُٹھ کر جانا چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے ہٹ کر، زنانہ ویٹنگ روم کے دروازے پر پہونچا، اور شریفہ سے باتیں کرنے لگا۔ باتیں کرنیکے بعد ماسٹر، ستون کی آڑ میں، بینچ کے کونے پر بیٹھ گیا، اور تھوڑی سی دیر میں کئی مرتبہ زنانہ ویٹنگ روم کے دروازے پر آیا گیا، ماسٹر، کچھ گھبرایا سا نظر آتا تھا، اور وہ ویٹنگ روم کے دروازے پر عورت سے باتیں کرنیکے بعد، فوراً ہی ستون کی آڑ میں جا کر بیٹھ جاتا تھا۔

ماسٹر کے انداز، اگرچہ شبہ میں ڈالنے والے تھے، مگر شمشاد نے اس کو شک و شبہ کی نگاہوں سے نہیں دیکھا، وہ بالکل خالی الذہن تھا، عام طور پر پردیس میں یا کسی اجنبی مقام پر جب کوئی جاننے والا مل جاتا ہے، تو خواہ مخواہ اس سے بولنے چالنے کو طبیعت چاہتی ہے، شمشاد اپنی بینچ سے خود ہی اُٹھ کر، ماسٹر کے پاس پہونچا، ماسٹر بینچ کے سہارے تکیہ لگا کر، سگریٹ پی رہا تھا، شمشاد نے اچانک پہونچ کر، ماسٹر کی آنکھیں پیچھے سے بند کرلیں،

یہہ کیا بیہودہ مذاق ہے، اجی تم ہو کون ؟ —— ماسٹر گھبرا کر بولا۔

ہم سب کچھ ہیں، اس سے آپ کو کیا —— اور —!

شمشاد کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ ماسٹر نے جھٹکا دیکر، شمشاد کے ہاتھ آنکھوں سے ہٹا دئے، شمشاد نے خوب زور کا قہقہہ لگایا، اور ماسٹر شمشاد کی صورت دیکھ کر، سہم گیا۔

بھئی! ماسٹر کہاں جانیکی تیاری ہے —— شمشاد بنچ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

تیاری کہیں جانے کی نہیں ہے، میرے بھائی طوفان ایکسپریس سے آرہے ہیں، اُن کے لینے کے لئے آیا ہوں —————— ماسٹر نے گھبرا کر جواب دیا۔

تو آپ اکیلے ہی آئے ہیں، یا کوئی ساتھ بھی ہے۔ شمشاد نے دریافت کیا۔

ساتھ کون ہوتا —! اکیلا ہی ہوں، آپ کو نظر نہیں آتا، کیا آپ کو میرے پاس کوئی بیٹھا ہوا دکھائی دیتا ہے —————— ماسٹر، اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

ارے! ماسٹر صاحب! آپ ذرا سی بات کا بُرا مان گئے، میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے ساتھ کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے، مگر میں نے آپ کو زنانہ ویٹنگ روم میں کسی عورت سے کئی بار بات کرتے ہوئے دیکھا

ہے، اسی لئیے میں نے آپ سے یہہ بات دریافت کی کہ

کوئی اور ساتھ تو نہیں ہے ——— شمشاد نے جواب دیا

شمشاد کا یہہ سوال سُن کر، ماسٹر ایک دم خاموش ہوگیا، اُس کا چہرہ فق پڑ گیا، اور اُس کی آنکھوں سے چوری ٹپکنے لگی،

جی ہاں! میری بہن میرے ساتھ ہیں ——— ماسٹر بہت ہی دبی اور جھجکی ہوئی آواز سے بولا

ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ میں تنہا ہوں، میرے ساتھ کوئی نہیں ہے ——— شمشاد نے پیر ہلاتے ہوئے کہا۔

میں سمجھا کہ آپ یہہ پُوچھ رہے ہیں کہ کوئی مرد تو آپ کے ساتھ نہیں ہے ——— ماسٹر نے جواب دیا۔

آپ کی بہن، اور زنانہ ویٹنگ روم میں، آپ نے تو ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ ہمارے یہاں پردہ نہیں ہے عورتیں آزادی کیساتھ باہر آتی جاتی ہیں ——— شمشاد نے دریافت کیا

جی ہاں! میں نے جو کچھ کہا تھا، ٹھیک کہا تھا، مگر میری یہہ بہن پردہ کرتی ہیں ——— اور ہاں! شمشاد صاحب! آپ کو تو قیصرپور جانا ہے، قیصرپور کی گاڑی آدھ گھنٹہ میں چھوٹ جائیگی، ٹکٹ خرید لیجئے، ایسا نہو کہ گاڑی چھوٹ جائے، اور آپ یہیں باتیں کرتے رہ جائیں ——— ماسٹر نے گفتگو کا موضوع

بدلتے ہوئے کہا۔

ماسٹر اتنی بات کہہ کر، پیشاب کے بہانے چلا گیا، ماسٹر کی گھبرائی ہوئی باتوں
بے جوڑ فقروں اور متوحش انداز سے شمشاد کو حیرت ہوئی کہ یہ اچھا خاصا آدمی، آج
سی باتیں کر رہا ہے۔

شریفہ کا باپ ضلعدار، قیصر پور جانے کے لئے تانگہ میں بیٹھ کر اسٹیشن آیا، اور
اتفاق کی بات کہ اُس کا تانگہ مسافر خانہ کی سڑک پر اُسی جگہ رُکا، جہاں سے بہت قریب
شمشاد بیٹھا ہوا، ضلعدار نے شمشاد کو دور سے پہچان لیا، وہ تانگہ سے اترتے ہوئے بولا۔

شمشاد صاحب! بھائی بڑی عمر ہے آپ کی، آج صبح ہی
ایک صاحب سے بڑی دیر تک آپ کا ذکر رہا ــــ ہاں! تو قیصر پور
چل رہے ہیں آپ۔؟ کیا ٹکٹ لے لیا ــــ بھئی! آپ کیساتھ
راستہ خوب کٹیگا ــــــــ

شمشاد نے اس کے جواب میں کہا:۔

ہاں! میں مکان ہی چل رہا ہوں، ٹکٹ میں نے ابھی
نہیں لیا، ایسی جلدی کیا ہے، طوفان ایکسپریس کے آکر چلے جانے کے
بعد، کہیں ہماری گاڑی چھوٹے گی۔
آپ کے ماسٹر محمود سے اتفاقیہ یہاں ملاقات ہو گئی
کسی ضرورت سے اِدھر گئے ہیں، اُن ہی کے انتظار میں بیٹھا ہوا
ہوں ــــــــ

شریفہ کا باپ ضلعدار، شمشاد کے پاس بنچ پر آکر بیٹھ گیا، اور اتنے میں ماسٹر

بھی آگیا، ضلعدار کو دیکھتے ہی ماسٹر کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا، اُس کے قدم بہکے ہوئے پڑنے لگے، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے بجلی کے زور سے اُس کی رُوح کھینچ لی گئی ہے۔

ماسٹر صاحب! آپ یہاں کیسے — ! ضلعدار نے ہینڈ بیگ کو چھوتے ہوئے کہا

میں اپنے بھائی کے "رشتہ بیاہ" کرنے کے لئے آیا ہوں، وہ اس گاڑی سے آرہے ہیں —— ماسٹر نے جواب دیا۔

قیصر پور سے آپ کب آئے —— ضلعدار نے دریافت کیا۔

قیصر پور سے آئے ہوئے تو کئی دن ہو گئے — ماسٹر گھبرا کر بولا۔

میرے پاس تو کل ہی مُلازم، شریفہ کی والدہ کا خط لیکر آیا ہے، اُس میں لکھا تھا کہ ماسٹر صاحب یہاں موجود ہیں، ابھی دو ایک دن اور رہیں گے، آپ فرماتے ہیں کہ قیصر پور سے آئے کئی دن ہو گئے۔ ضلعدار نے کہا۔

حیرت ہے کہ بیگم صاحبہ نے ایسی بات کس طرح لکھ دی۔

ماسٹر نے بات ختم کی، اور زنانہ ویٹنگ رُوم کی مُلازمہ نے آکر ماسٹر سے کہا کہ بیگم صاحبہ آپ کو بُلا رہی ہیں۔

مجھے بُلا رہی ہیں، بیگم صاحبہ — ! —— ماسٹر نے انگلیاں

چینخاتے ہوئے جواب دیا

جی ہاں! آپ ہی کو بلا رہی ہیں، وہی نیلے
برقعے والی، جو آپ کیساتھ آئی ہیں، اُن کو کچھ تکلیف
معلوم ہوتی ہے، ابھی ابھی چپکے چپکے رو رہی تھیں
چلیئے، جلدی چلیے! ——— ملازمہ نے کہا۔

ماسٹر کے لئے یہہ انتہائی نازک اور کشمکش کا موقعہ تھا، وہ تھوڑی دیر
چپ کھڑا رہا، یہاں تک کہ اُس نے اپنے پراگندہ حواس جمع کر لئے، ضلعدار
اور شمشاد، اس کا مُنہ تک رہے تھے، اور دونوں طرف سکوت طاری تھا،

بیگم صاحبہ سے کہئے میں ابھی آتا ہوں، میرے
روپیوں کا بٹوا، بک اسٹال پر رہ گیا ہے، ریل کے
ٹکٹ بھی تو اُسی میں تھے۔

ماسٹر نے، ویٹنگ روم کی ملازمہ کو مخاطب کرتے ہوئے یہہ جملے کہے
اور اس تیزی کیساتھ، اسٹیشن کی طرف دوڑا، جیسے سچ مچ کوئی چیز بھول آیا ہو
ماسٹر بڑی پھرتی کیساتھ جنکشن کے پلیٹ فارم پر پہونچا، پلیٹ فارم پر پہونچکر اُس
نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کوئی اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ لیکن شمشاد اور ضلعدار
کو اُس کا پیچھا کرنے کی کیا ضرورت تھی، وہ تو حقیقت سے بالکل بے خبر تھے، ماسٹر
نے مال گودام کے دروازے سے باہر سڑک پر آکر، شہر کے لئے تانگہ کیا، اور چلتا
بنا۔

ویٹنگ روم کی ملازمہ نے ماسٹر کی کہی ہوئی بات، شریفہ سے جا کر

لوٹ دی، شریفہ کو ماسٹر کی بات سے قدرے پریشانی ہوئی، اور اس نے ویٹنگ رُوم کے دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا، شریفہ کا باپ ضلعدار، ویٹنگ روم کے دروازے کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، ایک دوسرے کو دونوں نے دیکھا، شریفہ باپ کو دیکھ کر، اندر ہو گئی، ضلعدار کو شریفہ کے ویٹنگ روم میں ہونے کا وہم بھی نہ ہو سکتا تھا، مگر اس نے اپنی آنکھ سے شریفہ کو دیکھا تھا، اس لئے وہ عجیب کشمکش میں گرفتار ہو گیا۔

قیصر پور کے لئے ٹرین چھوٹنے میں، بہت ہی کم دیر رہ گئی تھی، شمشاد نے اُٹھتے ہوئے کہا، کہ ضلعدار صاحب! چلئے ٹکٹ لے لیں، گاڑی چھوٹنے ہی والی ہے، ضلعدار اس کے جواب میں بولا:۔

بہت اچھی بات ہے، ضرور ٹکٹ لے لیجئے، مگر ہاں!
وہ شریفہ نہیں تھی، دنیا میں انسانوں کے چہرے ملتے جلتے بھی تو ہوتے ہیں ــــ

ضلعدار کے اِس بے جوڑ جواب پر، شمشاد نے کہا:ــــ

شریفہ ـــ! واہ! شریفہ کا یہاں کیا ذکر ہے، ضلعدار صاحب، یہ آپ کیا خواب دیکھ رہے ہیں، صاف صاف کہئے، آپ کس خیال میں ہیں، اور کیا کہنا چاہتے ہیں۔

ضلعدار نے اس کے جواب میں کہا کہ میں نے ابھی ابھی زنانہ ویٹنگ رُوم میں ایک لڑکی کو دیکھا ہے۔ اس کا چہرہ، بالکل میری لڑکی شریفہ سے ملتا جلتا ہے، ناک، نقشہ، آنکھیں، قد، بالکل شریفہ جیسا ـــ!

ماسٹر نے جو شمشاد سے گفتگو کی تھی کہ میرے ساتھ کوئی نہیں ہے، میں بالکل تنِ تنہا ہوں، اُس کے بعد کہا کہ میری بہن میرے ساتھ ہے، پھر شمشاد کے جرح کرنے پر بولا کہ میری یہہ بہن پردہ نشین ہے۔ یہہ تمام باتیں ضلعدار کے فقروں کیساتھ مل کر ایک پُر اسرار داستان بن گئی، شمشاد نے زنانہ ویٹنگ رُوم کی ملازمہ کو اشارے سے بُلا کر، اُس سے پوچھا، کہ ویٹنگ رُوم میں اس وقت کتنی عورتیں ہیں، مُلازمہ نے جواب دیا کہ اب تو کُل تین عورتیں رہ گئی ہیں، ایک بجے کی ٹرین سے بہت سی عورتیں چلی گئیں۔

جن بیگم صاحبہ نے اُن صاحب کو بُلایا تھا،

جو اپنے روپیوں کا بٹوا لینے کے لئے دوڑے ہوئے

گئے ہیں، کیا اُن سے تمھاری کچھ بات چیت ہوئی ہے۔ شمشاد نے مُلازمہ

سے پوچھا۔

جی ہاں! میں نے اُن سے باتوں باتوں میں،

پُوچھا تھا کہ آپ کہاں سے آرہی ہیں، تو اُس کے جواب

میں اُنھوں نے کہا کہ میں قیصر پور سے آرہی ہوں،

پھر فوراً ہی گھبرا کر بولیں، ارے! میں نے غلط کہا،

میں تو مغل سرائے سے آرہی ہوں، ——— ملازمہ نے جواب دیا۔

شریفہ کا باپ ضلعدار، حیرت اور بے چینی کیساتھ شمشاد اور ملازمہ کی باتیں سُن رہا تھا، مُلازمہ کے جواب سے شمشاد کو بڑی حد تک یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہہ ماسٹر کی فتنہ پردازی ہے، اور "وہ لڑکی" جسے ضلعدار نے دیکھا ہے، یقیناً

شریفہ ہے۔ اس شبہ کے یقین سے بدل جانے کی ایک وجہ یہہ بھی تھی کہ ماسٹر، اسٹیشن جاکر واپس نہیں ہوا۔ شمشاد نے دو تین منٹ تامل کیا، اور پھر ملازمہ سے بولا، کہ اسی لڑکی سے جس کا تم نے ابھی ذکر کیا ہے، جاکر کہو کہ تمہارے والد ضلعدار صاحب تم کو بلا رہے ہیں، ملازمہ نے ویٹنگ روم کے اندر جاکر کہا:۔

بیگم صاحبہ! آپ کے والد ضلعدار صاحب آپ کو باہر بلا رہے ہیں۔

شریفہ نے ملازمہ کی بات سن کر گردن نیچے جھکالی اور چپکے چپکے رونا شروع کیا۔ جب ملازمہ چلی گئی تو ضلعدار نے، شمشاد کو ٹہوکا دیکر کہا:۔

بھائی شمشاد! آپ بھی عجیب آدمی ہیں، ایک غیر عورت کے پاس بے دھڑک پیام بھیجدیا کہ تمھارے باپ تم کو بلا رہے ہیں، مجھے تو آپ کی متانت اور سنجیدگی سے ایسی امید نہ تھی، کہیں مذاق، مذاق میں کوئی آفت نہ آجائے۔

شمشاد اس کے جواب میں بولا:۔

ضلعدار صاحب! یہہ بھید ابھی کھلا جاتا ہے۔ کہ میں مذاق کر رہا ہوں، یا میری سنجیدگی جاسوسی کے زبردست فرائض انجام دے رہی ہے۔ گھبرایئے نہیں، تماشائی کی طرح پردے کے اٹھنے کا انتظار فرمایئے۔

ملازمہ نے شریفہ سے بہت کچھ کہا کہ آپ میری بات کا کچھ جواب دیجئے، مگر وہ برابر روتی رہی، جب ملازمہ کو بہت دیر ہوگئی، تو شمشاد نے ویٹنگ روم کے دروازے

پر جاکر، تالی بجائی، ملازمہ تالی کی آواز سن کر باہر آئی، اور کہا کہ آپ کی بات میں نے بیگم صاحبہ سے کہہ دی، وہ سر جھکائے ہوئے رو رہی ہیں، جواب نہیں دیتیں۔

اچھا! تمھارے ویٹنگ رُوم میں، ان بیگم صاحبہ کے علاوہ، جو دو عورتیں ہیں، اُن سے کہہ دو، کہ دو منٹ کے لئے ذرا پردے میں ہو جائیں ———— شمشاد نے ملازمہ سے کہا

بہت اچھا! میں اُن سے ابھی جاکر کہتی ہوں۔ ملازمہ نے جواب دیا۔

شمشاد نے ضلعدار کو اشارے سے بلایا، ضلعدار دوڑا ہوا آیا، اور گھبرا کر بولا۔

بھئی شمشاد! یہہ کیا کر رہے ہو؟

شمشاد نے جواب دیا:۔

جو کچھ میں کر رہا ہوں، وہ آپ کو ابھی معلوم ہو جائے گا۔

گھبرائیے نہیں ————

اتنے میں ملازمہ نے آکر کہا کہ دونوں عورتیں پردے میں ہو گئیں۔ اور وہ بیگم صاحبہ بدستور رو رہی ہیں۔

ضلعدار صاحب! آپ ویٹنگ رُوم میں بے دھڑک چلے جائیے، آپ کو وہاں آپ کی لڑکی شریفہ ملیگی۔ شمشاد نے کہا۔

میری لڑکی شریفہ، اور ویٹنگ روم میں، عجیب کس قسم کی باتیں ہیں آپ کی، شمشاد صاحب! کیا آپ مجھے پھنسوانا چاہتے ہیں، بھائی! اسی مہینہ کی بات ہے کہ ہمارے ہی ہند کے محکمہ تار بابو کو ایک عورت کے ذرا

چھیڑ دینے پر، دو مہینہ کی سزا ہو چکی ہے، مجھ بوڑھے آدمی کو

آپ قربانی کا بکرا کیوں بنانا چاہتے ہیں ——— ضلعدار نے جواب دیا۔

میں آپ کو نہ تو قربانی کا بکرا بنانا چاہتا ہوں، اور

نہ آپ کے خلاف کوئی سازش کرنا مقصود ہے، میں جو کچھ

کہہ رہا ہوں، اُس پر عمل کیجئے، جائیے، اندر جائیے! آپ

کس سمجھ کے آدمی ہیں، کہ اتنی کچھ باتیں سُننے اور دیکھنے

کے بعد بھی، آپ کچھ نہیں سمجھ سکے، تعجب ہے ——! آدمی

کو اتنا غائب دماغ اور سیدھا بھی نہ ہونا چاہیئے ——— شمشاد نے جواب دیا۔

اچھا! میں ویٹنگ روم کے اندر جانے کو تیار ہوں

مگر صاحب! میری شریفہ! یہاں کس طرح آسکتی ہے، یہہ

بات تو واقعی میری سمجھ میں نہیں آتی ——— ضلعدار چھڑی اوپر کو

اُٹھاتے ہوئے بولا۔

یہہ بات کہ شریفہ یہاں کس طرح آئی، شریفہ کی ہی

زبانی آپ کو معلوم ہوگی دیکھئے! زیادہ حجت نہ کیجئے،

خدا کے لئے! اندر جائیے، زیادہ تاخیر مناسب نہیں۔ شمشاد نے قدرے

تیزی کیساتھ کہا۔

ضلعدار، شمشاد کے کہنے سے ویٹنگ روم کی طرف بڑھا، پہلے وہ دروازے

پر کئی بار کھانسا، اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک عورت نیلے رنگ کے

بُرقعہ میں لپٹی ہوئی چپکے چپکے رو رہی ہے، بات کرنے کی اسکی ہمت نہ پڑتی تھی، وہ دل

ہی دل میں کہنے لگا :۔

شریفہ کے برقعہ کا رنگ بھی نیلا ہے، اور ہاں! اس عورت کا پمپ شو، ارے ۔! میں شریفہ کے لئے نمائش سے بالکل اسی میل کا جوتا خرید کر لایا تھا ۔ یہہ معمہ کیا ہے ۔ (شریفہ کی چند انگلیاں کھلی ہوئی تھیں) اور ہاں! اس کی انگلیاں، شریفہ کی انگلیوں سے ملتی جلتی ہیں، اور انگوٹھی بھی بالکل وہی ہے ۔

ضلعدار کو پدری محبت کے جوش نے بے تاب کر دیا اُس نے اپنے تصورات پر جرح و تعدیل کئے بغیر، شریفہ کے شانے کو ہلا کر، بھرائی ہوئی آواز میں کہا :۔

شریفہ! تم یہاں کیسے ۔۔۔!

شریفہ، باپ کی انگلیوں کے لمس کو محسوس کرتے ہی، باپ سے لپٹ کر رونے لگی ضلعدار کا بھی دل بھر آیا، اور اُسکی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے ۔

ویٹنگ رُوم کی ملازمہ یہہ دیکھ کر باہر آئی اور شمشاد سے جا کر کہا کہ وہ بیگم صاحبہ اور جن صاحب کو آپ نے بھیجا ہے، دونوں کے دونوں رو رہے ہیں، آپ کسی طرح اُن صاحب کو باہر بلا لیئے، صُبح کے وقت میم صاحبہ معاینہ کرنے کے لئے آتی ہیں، زنانہ میں مرد کو دیکھیں گی، تو مجھے نہ جانے کیا کیا کہیں گی ۔

شمشاد نے ملازمہ کے ہاتھ میں چونی پکڑاتے ہوئے کہا کہ تم گھبراؤ نہیں، میں ابھی دونوں کو باہر بلاتا ہوں شمشاد نے دروازے سے جھانکا، تو شریفہ، ضلعدار سے لپٹی ہوئی سسکیاں لے رہی تھی، اور ضلعدار بھیگے ہوئی پلکوں کو ہتھیلیوں سے پونچھ رہا تھا ۔

شمشاد نے دروازے کے قریب جا کر کہا کہ ضلعدار صاحب! شریفہ کو لیکر باہر آجائیے، ایکسپریس آرہا ہے، دوسری زنانی سواریاں آگئیں، تو آپ دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر کیا کہیں گی، ضلعدار نے، شریفہ کو بہت کچھ تسلّی دی، اور کہا کہ اب رونا دھونا ٹھیک نہیں ہے، مردانہ مسافرخانہ میں مذاق بن جائے گا، شریفہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی، اور دونوں ویٹنگ روم سے باہر آگئے۔ قیصرپور جانے والی گاڑی چھوٹ چکی تھی، اور گاڑی نہ بھی چھوٹتی تو بھی ضلعدار اس واقعہ کے بعد قیصرپور جانے کے لئے تیار نہ تھا۔

افواہیں

ضلعدار نے، سرائے کے لئے تانگہ چکایا، اور تینوں تانگہ میں بیٹھ کر روانہ ہوئے اور ذرا سی دیر میں، سرائے پہونچ گئے۔ سرائے میں پہونچکر، ضلعدار نے شمشاد کے پیر پکڑ لئے کہ عزت، آبرو آپ کے ہاتھ ہے، اس بھید کو جہاں تک ہو سکے چھپانے کی کوشش کیجئے، اور ہاں! میں تو اب قیصرپور میں مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا، میں اب وہاں قدم بھی نہیں رکھہ سکتا۔ میں دو ایک دن میں صاحب سے مل کر دو مہینہ کی رُخصت لیلوں گا، اُس کے بعد قیصرپور کے علاقہ سے کسی اور علاقہ میں تبادلہ کی کوشش کروں گا، شریفہ کی ماں، شریفہ کے یکایک غائب ہو جانے کی وجہ سے بہت پریشان ہونگی، اور قصبہ میں نہ جانے! لوگ کیا کیا بہتان باندہ رہے ہونگے، آپ خدا کے لئے اتنا کیجئے کہ میرا خط قیصرپور لیکر چلے

جائیے، یا کسی اپنے راز دار اور خاص آدمی کے ہاتھ بھجوا دیجئے، شمشاد نے ضلعدار کو بہت کچھ کہا سُنا، مگر آپ پر مغرب زدگی، اور زمانہ کی تہذیب اور فیشن کے تصورات چھائے ہوئے تھے، آپ نے دیکھ لیا کہ میں نے جو کچھ کہا تھا کہ وہ کس قدر دُرست نکلا، لیکن اب میں اس داستان کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا، آپ خود اپنی غلطی پر دل میں پشیمان ہو رہے ہوں گے، اور میں سمجھتا ہوں، اور سمجھتا کیا ہوں، بلکہ اس بات پر میرا ایمان ہے کہ ندامت اور پشیمانی سے غلطی کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ندامت، حقیقت میں ایک طرح کی توبہ ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ توبہ کے بعد، پچھلی غلطیوں اور کوتاہیوں کو دہرانا کچھ اچھا نہیں ہے۔ میں آپ کا خط لیکر خود ہی قیصرپور جاتا ہوں، اور دو چار دن کے بعد پھر واپس آتا ہوں، جب تک آپ کی موجودہ حالت میں بھی کمی ہو جائیگی، اور اُس وقت آپ کسی بات کے متعلق صحیح رائے قایم کر سکیں گے۔

ضلعدار نے بیوی کے نام خط لکھ کر، شمشاد کو دیا کہ کمال خاں کو لیکر فوراً یہاں چلی آؤ، سامان بعد میں منگا لیا جائے گا، اور گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، شریفہ میرے پاس موجود ہے۔ شمشاد نے ضلعدار کے یہاں خط پہونچا دیا، اور ضلعدار کی بیوی، کمال خاں کیساتھ دوسرے دن صبح کو قیصرپور سے روانہ ہو گئی۔

قیصرپور میں شریفہ کی یکایک گم شدگی کے متعلق عجیب عجیب روایتیں مشہور تھیں، یہی موضوع ہر زبان پر چڑھا ہوا تھا، اور اس خبر نے قیصرپور میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ مردوں کی صحبتوں میں اس واقعہ کو عجیب عجیب پیرایہ میں بیان کیا جاتا تھا:۔

انگریزی پڑھی ہوئی عورت کہیں پردے میں بیٹھ سکتی ہے، کوئی شخص اُسے ضرور بھگا لیگیا، اور صاحب! یہہ کہنا بھی غلط ہے، ایسی آزاد عورتیں تو مردوں کو خود بھگا لیجاتی ہیں، بھلا مرد اُن کے بھگانے کی کیا ہمّت کرسکتا ہے ـــــ

ایک کرشٹان جیسا شخص، ضلعدار کی بیٹی کو سُنا ہے کہ گانا سکھانے کے لئے آتا تھا، جوان، آدمی کیسا تھ، جوان عورت کی تنہائی! کیا خبر ہے کہ کسی راز کو چھپانے کے لئے ضلعدار کی لڑکی نے خودکشی کرلی ہو، یہہ آج کل کی لکھی پڑہی عورتیں تو جان کو ہتھیلی پر لئے پھرتی ہیں، جہاں کوئی خلاف مرضی بات ظہور میں آئی، جھٹ سے خودکشی کرلی۔ اسی ہفتہ کے اخبار میں ہم نے پڑھا ہے کہ بمبئی میں ایک پارسی لڑکی، کسی بات پر والدین سے ناراض ہوکر سمندر میں گر کر ہلاک ہوگئی ـــ

اس لڑکی کو میں نے ایک دفعہ دیکھا تھا، تھی تو بڑی خوبصورت سُنا ہے کہ اس کا رشتہ جہاں ہونے والا تھا، اُس رشتہ سے وہ ناراض تھی، کیا عجب ہے کہ اُسی غصہ میں وہ گھر سے نکل بھاگی ہو۔ مگر اس کو ماں باپ کی عزت کا تو کچھ لحاظ کرنا چاہیئے تھا۔ تم دیکھ لینا، یا ہر جاکر اس لڑکی کی مٹی پلید ہوجائے گی، جب تک جوانی ہے، اس وقت تک لوگ خوب آؤبھگت کریں گے اُس کے بعد تم اُس کو کسی چکلے میں بیٹھا ہوا دیکھنا ـــــ

سُنا ہے کہ چین اور برما کے کُچھ لوگ فقیروں کے بھیس میں پھرتے ہیں، اور لڑکوں، لڑکیوں کو بہکا کر اور زبردستی پکڑ کر لیجاتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ کسی ایسے ہی فقیر کے ہاتھ یہہ لڑکی پڑ گئی ہو، قیصر پور کی عورتوں کی باتیں، مردوں سے زیادہ مزیدار تھیں:۔

خالہ جان! سُنا، ضلعدار کی لڑکی شریفہ بھاگ گئی، ضرور بھاگ گئی ہوگی، اگر وہ نہ بھاگتی تو مجھے تعجب ہوتا۔ اُس لڑکی کے رنگ ڈھنگ ہی کچھ ایسے تھے، ایک دفعہ میں اُسکے یہاں گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ ہونٹوں پر کوئی لیدار لال چیز لگا رہی ہے، آئینہ سامنے رکھا ہے، اور خوب بن سنور رہی ہے، میں نے اُسکی ماں سے پوچھا کہ آج کیا کہیں جانے کا ارادہ ہے، اس کی ماں نے جواب دیا کہ میں تو آج کہیں جانے کا ارادہ نہیں رکھتی، اتنے میں شریفہ بن سنور کر آگئی، قمیص پر واسکوٹ تو اُس نے ایسی چُست پہنی تھی، کہ سینہ کے بٹن ٹوٹے جارہے تھے، اور اُس کے بدن پر خواہ مخواہ نگاہ پڑتی تھی۔ ہونٹ بالکل لال بھبوکا بنے ہوئے تھے، میں نے اُس سے پُوچھا کہ تم نے ہونٹوں پر جو مرہم لگا رکھا ہے، تو کیا تمھارے ہونٹوں میں کوئی تکلیف ہے، میرے اس کہنے پر شریفہ اور اُسکی ماں دونوں نے اس زور سے قہقہہ لگایا کہ میں تو کھسیانی ہوگئی۔ میں نے ہنسنے کا سبب پوچھا تو بولی کہ یہہ مرہم نہیں ہے، سُرخ ہونٹ بھلے لگتے ہیں، اسی لئے

ہونٹوں پر یہہ چیز لگائی گئی ہے۔

اورہاں سکینہ بہن! میں اپنے چھوٹے بھائی سراج کا، ضلعدار کے یہاں پیغام لیکر گئی تو شریفہ کی ماں نے کہا کہ ہم گاؤں، یا قصبہ میں اپنی بیٹی کو دیکر اس کی قسمت ہرگز نہ پھوڑیں گے، ہماری شریفہ کو تو کوئی انگریزی پڑھا لکھا تیز ممبر چاہیئے ۔ میرے اللہ نے اچھا ہی کیا، جو اس لڑکی کا رشتہ میرے بھائی کے ساتھ نہ ہوا، میرا بھائی تو ابا کے سر کی قسم، اپنا اور اُس کا خون کر ڈالتا۔

بی بی — ! میں نے شریفہ کی ماں کو کئی مرتبہ ٹوکا کہ بیاہی بیٹی کا گھر میں رکھنا، اچھا نہیں، مگر اُسکی ماں نے بگڑ کر جواب دیا کہ میری بیٹی ہے، میں جب چاہونگی، بیاہونگی، آپ پر اُسکا کونسا بوجھ ہے، جو اُس کے اتارنے کی ایسی فکر چڑھی ہوئی ہے،

اجی! بھابی! ہم بھی تو آخر ایک دن جوان تھے، اور تم نے تو میری جوانی دیکھی ہے، خدا لگتی کہنا، میری ہمجولیوں میں، میرے پلّے کا کوئی تھا۔ میں اللہ آمین سے چار بچوں کی ماں ہوں، مگر اب بھی اس زمانہ کی جوان لڑکیوں سے کم نہیں ہوں، تو ہاں! اپنی جوانی میں ہم اباجان کی غیر موجودگی میں کبھی کبھا ایک آدہ گیت گنگنا لیا کرتے تھے، ایک دن میں گیت خوب زور زور سے گا رہی تھی، اباجان نہ جانے کہاں سے آگئے

اور اُنھوں نے آکر جو میری مرمت شروع کی ہے، تو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا۔ ہماری تو گھٹی میں غیرت ملا کر پلائی جاتی تھی، مگر یہہ شریفہ تو ایک غیر مرد سے گانا سیکھتی تھی، ہو نہ ہو یہہ اُسی مردوے کی کارروائی ہے، شریف لڑکیاں کہیں گانا سیکھا کرتی ہیں،

بڑی ماں! میں نے اُسکی کتابوں میں عورتوں، مردوں کی ایسی بُری تصویریں دیکھی تھیں۔ کہ ان کا ذکر کرتے ہوئے مجھے تو شرم آتی ہے۔ اور یہ شریفہ اس طرح ٹھٹھا مار کر ہنستی تھی، جیسے یہہ کئی بچوں کی ماں ہے، کنواری لڑکیوں کی تو شرم و حیا تو مشہور ہے۔

تم تو سب میری باتوں پر ہنسا کرتی ہو، میں یقین سے کہتی ہوں کہ ضلعدار کی لڑکی کو کوئی جن اُڑا کر لیگیا، میں نے اُس کی ماں کو ایک دفعہ ٹوکا بھی تھا کہ جوان بچی کو عطر، پھول کیسا کوٹھے پہ نہ بھیجا کرو، مگر اُس بڑھیا نے میرا کہا نہ مانا، یہہ جن بڑے عاشق مزاج ہوتے ہیں، شام کو جب دونوں وقت ملتے ہیں، بستیوں اور آبادیوں میں پھرا کرتے ہیں، جہاں کوئی اچھی صورت نظر آگئی، بس اُسے لے اُڑے۔ وہ سب کو دیکھتے ہیں، اُن کو کوئی نہیں دیکھ سکتا، اب اسکی ایک ہی شکل ہے، کہ سیدوں کے محلہ کی مسجد کے ملاجی سے عمل پڑھوایا جائے، جن آپ ہی لڑکی کو اُس کے گھر پہونچا جائے گا۔

غرض جتنے منہ اتنی باتیں :۔

خانہ آبادی

شمشاد کے قیصر پور واپس آنے پر لوگوں نے اُس سے تازہ واقعہ کا تذکرہ کیا، شمشاد نے کہا کہ تم لوگ بلا وجہ کیوں فکر میں پڑے ہوئے ہو، لڑکی اپنے باپ کے پاس ہے، میں خود اُسے دیکھ کر آیا ہوں، افواہوں کو طرح طرح کے حاشیے چڑھا کر پھیلانا مناسب نہیں۔ شمشاد کی اس اطلاع نے کہ لڑکی اپنے باپ کے پاس ہے، لوگوں کے مُنہ بند کر دئے، اور افواہوں کا چڑھتا ہوا سیلاب، آن کی آن میں اُتر گیا، تین چار دن کے بعد شمشاد عظیم گنج پھونچا۔ ضلعدار نے دو ہفتہ کے لئے عظیم گنج میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا اور وہ رخصت کے لئے کوشش کر رہا تھا۔

شمشاد سے جب ضلعدار کی ملاقات ہوئی تو ضلعدار نے اس کا بہت شکریہ ادا کیا، اور پوچھا کہ قیصر پور میں لوگ میرے متعلق کیا کہتے ہیں، شمشاد نے کہا کہ میرے پہونچنے سے پہلے تو لوگ جو دل میں آیا، کہتے تھے، مگر میں نے جا کر جب کہا کہ لڑکی تو اپنے باپ کے پاس ہے، میں خود اُس کو دیکھ کر آیا ہوں تو اسکی بعد وہ لوگ مطمئن ہو گئے، بلکہ اپنی قیاس آرائیوں پر پشیمان ہونے لگے۔ ضلعدار نے کہا کہ میں تو شریفہ اور اسکی ماں کو وطن میں چھوڑ کر حج کو چلا جاؤں گا، مجھے تو لوگوں کو منہ دکھاتے ہوئے شرم آتی ہے، خدا ایسا کرے کہ مجھے اُسی پاک زمین میں موت آ جائے شمشاد نے ضلعدار کو تسلی دیتے ہوئے جواب دیا کہ زیارت حج سے میں آپ کو

نہیں روکتا، ایک مسلمان کے لئے اس سے بڑی اور سعادت کیا ہوسکتی ہے، لیکن آپ جوان بیٹی کو گھر میں چھوڑ کر حج کا ارادہ نہ کیجئے، آپ کے پیچھے نہ جانے کیا بات پیدا ہو جائے، ضلعدار نے کہا کہ ایسی خبریں دور دور پھیل جاتی ہیں، اب میری بیٹی کا رشتہ ہونا مشکل ہے، اسی کشمکش اور الجھن سے گھبرا کر تو میں حج کا قصد کر رہا ہوں، شمشاد نے ضلعدار کو تسلی دیتے ہوئے جواب دیا کہ آپ بالکل مطمئن رہئیے، اس کا بندوبست میں انشاءاللہ کر دونگا۔ اس واقعہ کے بعد شریفہ کا بیاہ ضرور کر دینا چاہیئے، اور آپ کی بیگم صاحبہ کو شریفہ کیساتھ، اس قسم کا برتاؤ کرنیکی ضرورت ہے، جو اُس کے دل سے، اس واقعہ کے اثر کو بڑی حد تک دُور کر دے۔

عظیم گنج میں شمشاد کا دوست افضل کپڑے کی تجارت کرتا تھا، افضل نے بہت ہی تھوڑے سرمایہ سے اس بیوپار کو شروع کیا تھا، مگر اُس کی دیانت داری اور محنت کی بدولت، چند ہی دن میں کام کہیں سے کہیں پہونچ گیا، وہ راست دساور سے مال منگاتا تھا، اور شہر میں اسکی بات بنی ہوئی تھی۔ افضل نے شمشاد سے کتنے ہی مرتبہ اپنی شادی کے متعلق ذکر کیا، اور شمشاد نے وعدہ بھی کر لیا کہ وہ اس سلسلہ میں ضرور کوشش کریگا، شمشاد کو اپنے قصبہ کی اصلاحی پروگرام نے فرصت نہیں دی، اِس لئے افضل کے بار بار یاد دلانے پر بھی، وہ کچھ نہ کر سکا۔

شمشاد، اپنے دوست افضل کے خیالات سے پُوری طرح واقف تھا، وہ شریفہ کی نسبت کو ذہن میں لیکر، افضل کے گھر پہونچا، افضل دیوانخانہ میں بیٹھا ہوا، اخبار پڑھ رہا تھا۔

السلام علیکم! سیٹھ افضل بھائی! ملک التجار۔ شمشاد نے زوردار

لہجہ میں کہا۔

وعلیکم السّلام! ارے کون! شمشاد ہو، آؤ آؤ بھئی! کدھر راستہ بھول پڑے ——— افضل نے گردن پھیر کر جواب دیا۔

تو یہ آپ پہلے سے پیش بندی فرما رہے ہیں، کہ کہیں میں شکوہ نہ کرنے لگوں، اور آپ کو پشیمان نہ ہونا پڑے۔ شمشاد نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

میری پشیمانی کی بھی ایک ہی رہی! قوم و ملک کے مُصلحین کو تو ایسی سیاسی قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ افضل، اخبار کو تہہ کرتے ہوئے بولا۔

بڑے دن کی تعطیلوں میں تم شکرگڑھ کے تالاب پر شکار کھیلنے گئے تھے، میں نے سُنا ہے کہ تم وہاں تین دن تک ٹھہرے رہے، قیصرپور وہاں سے کچھ دور تھوڑی تھا، اگر ذرا غریب خانہ پر قدم رنجہ فرما دیتے تو کیا بگڑ جاتا۔ مگر ہاں! آپ تو اب بڑے آدمی ہو گئے ہیں، چھوٹے آدمیوں کی کب پروا کرتے ہیں ——— شمشاد نے جواب دیا۔

بھئی شمشاد! تمھارا شکوہ بالکل درست، اور تمھاری خفگی سر آنکھوں پر! میں اپنے قصور کا اقرار کرتا ہوں، مگر تمہیں نہیں معلوم کہ میں کن مشکلات میں پھنسا

ہوا تھا، ہماری چنگی کے سکتیر کے لڑکے میرے ساتھ تھے، اُن کم بختوں سے میں نے بہت کچھ کہا کہ میں اپنے دوست سے قیصر پور جا کر مل آؤں، مگر وہ راضی نہیں ہوئے، ساتھیوں کو ناراض کر کے جانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ ابکی آم کی فصل میں کئی دن کے لئے قیصر پور آؤں گا بھائی تمھارے یہاں کی ماش کی دال، آم کا اچار اور کھیر یاد آتی ہے، تو زبان چٹخارے بھرنے لگتی ہے ——— افضل نے شمشاد کا ہاتھ تھام کر کہا۔

افضل نے نوکر کو آواز دیکر بلایا کہ پان لیکر آؤ، اور گھر میں کہہ دو کہ رات کا کھانا، ہم بھائی شمشاد کیساتھ کھائیں گے، اور ہاں —! دیکھو، شمشاد میاں کو سیخ کے کباب بہت پسند ہیں، تم کھانیکے وقت کلو نان بائی کے قریب کی دوکان سے گرم گرم کباب ضرور لانا —

کہیئے! اصلاحی پروگرام کی مصروفیت میں کوئی وقت تم نے ہمارے لئے بھی نکالا، یار! عجیب بیفکرے آدمی ہو۔ افضل نے اگالدان اُٹھاتے ہوئے بولا۔

کس کام کے لئے کہہ رہے ہو تم —! میں تو کچھ نہیں سمجھا، بعض تم بدرچاچ کی زبان میں باتیں کرتے ہو —— شمشاد نے جواب دیا۔

اللہ غنی —! اس سادگی پہ کون نہ مرجائے

اے خدا —! یعنی بالکل انجان بن کر باتیں کر رہے ہو، ارے

یہاں! میں اپنی شادی کے متعلق کئی دفعہ تم سے ذکر کر چکا ہوں، تمھارے تعلقات بہت لوگوں سے ہیں، اور تمھارے انتخاب پر بھی مجھے حد سے زیادہ اعتماد ہے، لیکن تمھارا یہہ حال ہے کہ سامنے تو سر ملا جاتے ہو کہ ضرور خیال رکھوں گا، اور پھر جو غائب ہوتے ہو، تو، دو پیسہ کا کارڈ بھی بھیجنے کی توفیق نہیں ہوتی ——— افضل نے کہا۔

ہاں! تو یہہ کہئے کہ جوانی گدگدی کر رہی ہے، شادی

شادی! میاں اس حالت میں بڑے مزے میں ہو، کوئی کالے سر کی پلے بندہ گئی، تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائیگا، قسم خدا کی شکار کھیلنے کے لئے ترس جاؤ گے، اب تو تم بالکل آزاد ہو، جہاں چاہا چلے گئے، جو چاہا کھالیا، پہن لیا ——— شمشاد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

شمشاد! میں تمھاری طرح قوم کا لیڈر تو ہوں نہیں کہ دن رات، لوگوں کو نصیحت کرتے کرتے اور سمجھاتے سمجھاتے اپنے کو تباہ کرلوں، اور دنیا کا کوئی خیال ہی نہ آئے، آزادی اچھی چیز ہے، مگر دنیا میں سب لوگ شادی بیاہ کرتے ہیں، اور یہہ رسم تو باوا آدم کے زمانہ سے چلی آرہی ہے، اور سچ تو یہہ ہے کہ عورت کے بغیر مرد کی زندگی ادھوری رہتی ہے، مجھے دیکھو! دن بھر دوکان پر

کام کیا، اب یہاں گھر پہ دیوانخانے میں آکر پڑا ہوا، اخبار پڑھ رہا ہوں، اور دوکان کی بے کیفی ابھی تک باقی ہے۔ افضل نے کُرتہ کا گریبان چھوتے ہوئے کہا۔

تو پھر تم شادی کے لئے بالکل تیار ہو، کچھ اونچ نیچ سوچنی ہو، تو سوچ لو ——————— شمشاد بولا۔

تیار اور بالکل تیار! اب کہو تو تمہارے ساتھ اٹھا ہوا چلوں، اور شادی کر کے اور دُلھن لیکر گھر واپس ہوں

آج تو بھائی شمشاد ضرور مینہ برسیگا، تم آدمیت کی باتیں کر رہے ہو ——————— افضل نے جواب دیا

اس پر شمشاد نے شریفہ کا پُورا قصہ نہایت تفصیل اور وضاحت کیساتھ افضل کو سُنا دیا۔ اُس نے آخر میں یہہ بھی کہا کہ اس بات کا مُجھ کو بڑی حد تک اطمینان ہے کہ اس مردود ماسٹر نے ممکن ہے، شریفہ کی نادانی سے فایدہ اُٹھاتے ہوئے، مذاق وذاق کر لیا ہو، لیکن شریفہ اب تک پاک دامن ہے۔ صورت، شکل بھی اچھی ہے، اور پڑھی لکھی بھی ہے۔ افضل کو شمشاد پر پورا بھروسہ تھا، وہ اس کو سنجیدہ، مفکر، دور اندیش خیر خواہ سمجھتا تھا۔ اس لئے اُس نے اس رشتہ کو خوشی کیساتھ منظور کر لیا۔ شمشاد رات بھر افضل کے یہاں رہا، اور اُس نے مختلف قسم کے ذکر نکال کر، اور طرح طرح کی باتوں سے اس کا اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ افضل نے اوپر دل سے، شرما حضوری شادی کی "حامی" بھر لی ہے، یا واقعی سوچنے سمجھنے کے بعد وہ تیار ہوا ہے، افضل اس رشتہ کے لئے ہر طرح تیار تھا، اور اُسکی باتوں سے دلی رضامندی ٹپکتی تھی۔

شمشاد نے صبح کا ناشتہ افضل کے یہاں کیا، اور اس کے بعد سیدھا ضلعدار کے پاس پہونچا، اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد شریفہ کی شادی کا ذکر نکالا، شمشاد نے نہایت تفصیل کیساتھ بات چیت کی، ضلعدار، افضل سے تھوڑا بہت واقف تھا، ضلعدار کی بیوی تو فوراً ہی راضی ہو گئی، ضلعدار بھی قریب قریب راضی تھا شمشاد نے اس پر کہا کہ یہہ رشتہ بڑا نازک ہے، آپ لوگ اچھی طرح نشیب فراز سوچ لیں، اور ہاں! شریفہ سے رائے لینے کی بہت زیادہ ضرورت ہے، کیوں کہ میں اور آپ تو سب کے سب رسمی تقریب کے بعد علیحدہ ہو جائیں گے، اُس غریب کی تو ساری زندگی کا سودا ہے۔ آپ شریفہ کی رائے معلوم کیجئے، اور خود بھی سوچئے، میں شام کو خود افضل کو یہاں بُلا کر لاؤں گا، شریفہ کو ایک نظر افضل کو ضرور دیکھہ لینا چاہیئے، ازدواجی زندگی میں سیرت اور کردار کو بہت کچھ دخل حاصل ہے، مگر "صورت" کی اہمیّت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، ضلعدار نے کہا کہ آپ کی رائے سے مجھے پُورا اتفاق ہے، شام کو آپ اور افضل میرے یہاں چائے پیجئے —

شمشاد، دوپہر کے وقت افضل کی دوکان پر پہونچا، اور بولا کہ چلیئے! نوشہ صاحب، سُسرال سے بلاوا آیا ہے، خوب بن سنور لیجئے، میں نے آپ کے حُسن کی بہت تعریف بُہت کر دی ہے، ایسا نہ ہو کہ مجھے چار شریف آدمیوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے افضل نے ہنستے ہوئے، شمشاد کا دامن پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا کہ تمہیں لوگوں کو خوب بے وقوف بنانا آتا ہے۔

شام کو افضل اور شمشاد، دونوں ضلعدار کے یہاں پہونچے چائے نوشی ہوئی اِدھر اُدھر کے تذکرے نکلے، شریفہ اور اُسکی ماں نے جھروکے سے افضل کو دیکھا

اور یہہ صحبت ختم ہوگئی، شمشاد اپنے دوست آفضل کو اُس کے گھر پہونچا کر، ضلعدار کے یہاں واپس آیا، ضلعدار نے کہا کہ میں اور شریفہ کی ماں تو پہلے ہی سے راضی تھے شریفہ سے دریافت کیا گیا تو اُس نے بھی رضامندی کا اظہار کر دیا، شمشاد نے کہا تو پھر بسم اللہ! نیک کام میں ہمیشہ جلدی کرنی چاہیئے، ضلعدار نے جواب دیا کہ مجھے آپ کی رائے سے پورا اتفاق ہے مگر اتنی جلدی مناسب نہیں ہے، مجھے کم سے کم ایک ہفتہ کا وقت تو ملنا چاہیئے اس عرصہ میں تھوڑا بہت سامان کر لوں گا، اور قریب کے عزیزوں کو اطلاع بھی دیدی جائے گی۔

آفضل نے تو شادی کے معاملہ میں شمشاد کو پورا اختیار دے دیا تھا، اُس نے ایک ہفتہ میں مختصر سا زیور اور دُلہن کے لئے جوڑے تیار کرالئے، اور انتہائی سادگی کیساتھ شادی کی تقریب پایۂ تکمیل کو پہونچ گئی۔ شریفہ دُلھن بن کر، سُسرال میں پہونچی، سُسرال والوں نے، حسین وجمیل دُلہن کا بڑی گرمجوشی کیساتھ استقبال کیا، شریفہ میں بڑی دلکشی پائی جاتی تھی، دُلہن بن کر تو وہ سرتا بقدم مقناطیس بن گئی کہ آدمی دیکھتے ہی، اُس کی طرف خودبخود کھنچتا تھا۔ خوبصورتی بھی عجیب چیز ہے، عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بدصورت دُلھن کے مقابلہ میں خوبصورت دُلھن کو سُسرال کے بچے تک آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، اور خوبصورتی کیساتھ سیرت بھی اگر نیک ہو، تو پھر ایسی دُلھن، سُسرال میں ملکہ بن کر رہتی ہے، شریفہ میں دونوں خوبیاں موجود تھیں شادی کے کچھ دن بعد، شمشاد سے ملاقات ہوئی تو آفضل نے شمشاد کا بہت شکریہ ادا کیا، اور اپنی شادی کے متعلق بڑی پرلطف اور اطمینان بخش باتیں کیں، شمشاد کو بھی بیحد خوشی ہوئی کہ میاں، بیوی دونوں خوش ہیں۔

افضل نے شریفہ کا نام بدل دیا وہ اُسے "نادرہ" کہہ کر پکارتا تھا، شریفہ کو بھی یہ نام پسند تھا، افضل اور نادرہ سچ مچ ایک دوسرے کے شریک حیات تھے،

ماسٹر محمود، جو شریفہ کو موسیقی کی تعلیم دیا کرتا تھا، اس واقعہ کے بعد عظیم گنج سے فرار ہو گیا، اُس کے دل میں چور تھا، اس لئے ہر سپاہی کو دیکھ کر وہ سمجھتا تھا کہ وہ اُسے پکڑنے کے لئے آرہا ہے، اُس کو یقین تھا کہ شریفہ کے باپ نے انتقام لینے کے لئے اُس کے خلاف ضرور کارروائی کی ہوگی، وہ کچھ دنوں تک چور کی طرح اِدھر اُدھر بھاگا پھرتا رہا، عظیم گنج کے جس اسکول میں وہ ملازم تھا، وہاں کے ایک مدرس نے، جس سے ماسٹر نے قرضہ لیا تھا، یہہ دیکھ کر کہ وہ کئی مہینہ سے غائب ہے، اور اسکول میں نہ تو رخصت کی کوئی درخواست بھیجی، اور نہ کسی کو کوئی اطلاع دی، ماسٹر کے خلاف خیانت مجرمانہ کی کارروائی کر کے، اُس کے نام گرفتاری کا وارنٹ جاری کرا دیا، اور پولس نے اُس کا تعاقب شروع کر دیا، دو ایک جگہ تو ماسٹر اپنی چالاکی سے، پولس کے ہاتھ میں آکر نکل گیا مگر اب پولس اُس کا تیزی کیساتھ پیچھا کر رہی تھی۔ اُس کو دو ڈر لگے ہوئے تھے۔ ایک تو اسی خیانت مجرمانہ کے استغاثہ کا ڈر تھا، اور سب سے بڑا خوف ضلعدار کا تھا، ماسٹر چند دن تو اِدھر اُدھر چھپا پھرا، آخر کار لوگوں کی زبانی سُننے میں آیا کہ وہ نیپال کی طرف چلا گیا، اور اُس کا کوئی پتہ نہ چلا۔

شمشاد نے قیصر پور کی فضا کو بہت کچھ ہموار کر لیا تھا، اور اُس کے پروگرام کا

بڑا حصہ پایۂ تکمیل کو پہونچ چکا تھا۔ شمشاد میں قریب قریب وہ تمام خوبیاں موجود تھیں، جو ایک مُصلح اور ریفارمر میں ہونی چاہئیں، بے نفسی، لوگوں کے دُکھ درد کا صحیح احساس، ضبطِ نفس، تحمل، رواداری، عملی قوت اور شدائد سے نبرد آزما ہونے کی ہمت، یہہ تمام خوبیاں اس میں پائی جاتی تھیں، اُس کی اسکیم کے راستہ میں بہت سی رکاوٹیں پیدا کی گئیں، مگر اُس نے تمام مزاحمتوں کا دلیری اور استقلال کیساتھ مقابلہ کیا، دُنیا نے ہمیشہ اس قسم کے نیک لوگوں کیساتھ انتہائی سنگدلی کا برتاؤ کیا ہے، اور پھُول برسانے والوں کے راستوں میں سدا کانٹے بچھائے ہیں، اور قند و نبات کا شربت پلانے والوں کے لئے، زہر کے پیالے تیار کئے ہیں۔ بات یہہ ہے کہ مسخ فطرتیں اور مکروہ خبیث ذہنیتیں، اصلاح اور نیکی کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتیں، وہ کسی خرابی کے درست ہو جانے اور بُرائی کو اچھائی سے بدل جانے میں اپنی شکست اور نقصان محسوس کرتی ہیں، اس لئے وہ ہر اصلاح اور بھلائی کے خلاف قدم اُٹھاتی ہیں، اور اس مخالفت کے جوش میں وہ ہر خوفناک سے خوفناک گناہ اور شرمناک سے شرمناک جُرم کا ارتکاب کرسکتی ہیں۔ دُنیا کی تاریخ کے بہت سے ابواب ان ہی سیاہ کاریوں کی داستانوں سے سیاہ ہیں۔

شمشاد کے بھی قیصر پُور میں بہت سے مخالف پیدا ہو گئے، یہہ لوگ، قصبہ والوں کو شمشاد کی طرف سے بدظن کرنے کے لئے طرح طرح کی باتیں مشہور کرتے تھے، سب سے پہلے اُس کی دیانت پر حملہ کیا گیا، اور لوگوں میں یہہ خبر پھیلائی گئی کہ شمشاد نے پبلک کا بہت سا رُوپیہ اپنے نام سے بنک میں جمع کرا دیا ہے، شمشاد کے کانوں تک بھی یہہ خبر پہونچی، اور اُس نے پبلک فنڈ کا حساب ایک مشترکہ کمیٹی کے سامنے پیش کر دیا،

کمیٹی کے ارکان کو یہہ دیکھہ کر حیرت ہوئی کہ شمشاد نے کسی اعلان اور شہرت و نمود کے جذبے کے بغیر، اپنا ذاتی روپیہ پبلک کاموں میں صرف کیا ہے یہ بُرے لوگ شکست کھا کر، اور زیادہ شقی القلب اور مکروہ باطن ہوجاتے ہیں، شمشاد پر وہ جو الزام لگاتے تھے، اُسکی تردید کے بعد اُن کا سازشی جذبہ اور زیادہ تیز ہوجاتا تھا۔

شمشاد نے اپنے گھر میں قصبہ کی بچیوں کے لئے ایک اسکول قایم کر دیا تھا، شمشاد کی بڑی بہن کے ہاتھ میں اس اسکول کا انتظام تھا۔ شمشاد کے مخالفین نے لوگوں میں مشہور کر دیا کہ شمشاد اسکول کی بچیوں کو چھُپ چھُپ کر دیکھا کرتا ہے، اور اس زنانہ مدرسہ کے پردے میں وہ کوئی اور مقصد رکھتا ہے۔ شمشاد کو جب اس افواہ کا علم ہوا تو اُس نے ایک مکان، کسی دوسرے محلہ میں کرایہ پر لیا، اور اسکول کو وہاں منتقل کر دیا۔ جب مخالفین کا یہہ نشانہ بھی چُوک گیا تو ایک مسجد کے ملا سے سازش کر کے کہیں سے ایک فتویٰ منگا دیا کہ مُسلمان لڑکیوں کو لکھانا پڑھانا ناجائز ہے، بس زیادہ سے زیادہ قرآن شریف پڑھا دینا چاہیئے، اس سے زیادہ کچھ پڑھانا حرام ہے، اس فتنہ کو شمشاد نے جیسے تیسے دبایا، مستند اور مشہور علماء سے فتوے حاصل کئے اور بہت سی تقریریں کیں۔ شمشاد کی تقریروں کا لوگوں پر بہت اثر ہوا۔ شمشاد آتش بیان مقرر نہ تھا، لیکن چونکہ ہر بات دل سے نکلتی تھی، اس لئے اُس کے بے ترتیب جملے بھی نشتروں کا کام کرتے تھے" کہ اِدھر زبان سے بات نکلی، اور دل میں اُترتی چلی گئی۔

شمشاد بہت خاموشی کیساتھ کام کر رہا تھا، اور اُس کا پروگرام، صحافتی پروپگنڈے سے بے نیاز تھا، مگر خاموش پھُولوں کی خوشبو کی طرح، اُس کے کام کی شہرت بھی قرب وجوار میں پھیل گئی، اور پڑھے لکھے لوگ اُس سے ملنے کے لئے آنے لگے۔ ایک مرتبہ ایک عالم اُس سے ملنے کے لئے آئے، اور کئی دن رہ کر واپس چلے گئے" اس اتنی سی بات پر

مخالفین نے حاشیے چڑھائے کہ یہہ عالم جو شمشاد کے پاس آیا تھا، سلطان ابن سعود کا ایجنٹ تھا، سلطان نے کوئی بھاری رقم "وہابیت" کی تبلیغ کے لئے، شمشاد کے پاس بھیجی ہے جب ہی تو یہہ شمشاد نئی نئی باتیں نکالتا ہے کہ قبروں کو سجدہ کرنا شرک ہے، مزاروں پر چادریں چڑھانا بدعت ہے، قوالی سننا درست نہیں" یہہ وہابی ایسی ہی باتیں تو کرتے ہیں، ان کا تو مقصد ہی یہہ ہے کہ بزرگوں کا نام ونشان مٹ جائے، جو چیز بھی مانگو، یہہ کل کا لونڈا روپیہ کے لالچ میں آکر، ایسی بے دینی کی باتیں کرتا ہے، ہمارے بڑے بوڑھے تو اس سے زیادہ عقلمند اور اللہ رسول کی باتوں سے واقف تھے۔ شمشاد نے اس افواہ کی بھی تردید کی اور جہاں تک اس کا مقدور تھا، اس شبہ کو رفع کر دیا کہ سلطان ابن سعود نے اس کے پاس کسی ایجنٹ کو نہیں بھیجا، اور جن خیالات کی وہ تبلیغ کرتا ہے، وہی عین اسلام ہے۔

مخالفین کے جب تمام حربے بیکار گئے، تو انھوں نے اب سرکاری عہدیداروں سے ساز باز شروع کی، یہہ ان کا آخری اور کامیاب ترین حربہ تھا۔ سرکاری حکام کو شمشاد کا اصلاحی پروگرام ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا، اس پروگرام کی بدولت انکا جابرانہ اقتدار ختم ہو گیا تھا، اور انکی "خدائی" نزع کے آغوش میں آخری سسکیاں لے رہی تھی، جن لوگوں کے ہاتھوں میں انتظامی قوت ہوتی ہے۔ وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ رعایا کا سر نیاز، ہر دم ان کے آستانے پر جھکا رہے، لیکن قیصر پور کی تو دنیا ہی بدل چکی تھی، سب لوگ ایک دوسرے کیساتھ ہمدردی کرتے تھے، آپس میں جھگڑے بہت ہی کم ہوتے تھے، اور وہ بھی قومی پنچایت میں طے ہو جاتے تھے، حکام قیصر پور میں آتے ہوئے گھبراتے تھے، وہاں نہ تو کوئی مٹھی گرم کرنے والا ملتا تھا، اور نہ اس "جابرانہ حکومت" کا مزہ آتا تھا، جو ایک خاک نشین کو کم سے کم "خداوند نعمت" اور "ان داتا" بنا دیتی ہے۔

عہدیدار اس اصلاحی اسکیم کی کھل کر مخالفت بھی نہ کر سکتے تھے، کیوں کہ اُس کا کوئی جُز حکومت کے قانون اساسی سے نہیں ٹکراتا تھا چونکہ لوگوں میں ایکا تھا، اس لئے کسی مخالفانہ کارروائی کے لئے تائید بھی حاصل نہ ہو سکتی تھی۔

اب قیصر پور میں چند بد معاش لوگ پیدا ہو گئے تھے، اور انکی سازشی نظرت کے بھروسہ پر، سرکاری عہدیدار اس اصلاحی نظام کے درہم برہم کرنیکے لئے پر پُرزے نکالنے لگے۔ یہہ منافقین، عہدیداروں کے ہر دم کان بھرتے رہتے تھے، کبھی تحصیلدار سے کہہ دیا کہ آج شمشاد کہہ رہا تھا کہ تحصیلدار صاحب کی ساری حکومت خاک میں ملا دوں گا، کبھی تھانیدار کو ورغلا دیا کہ شمشاد آپ کے خلاف درخواستیں بھجوانیکی کوشش کر رہا ہے۔ عہدیدار کان کے کچّے ہوتے ہیں، وہ لوگوں کی کہی ہوئی باتونکی تحقیقات نہیں کرتے جس نے جو بھی کہا، سُن لیا، اور اُن کے دل میں اُسی وقت سے گرہ پڑ گئی۔ شمشاد سے حکام بہت زیادہ ناراض تھے، لیکن اُس کی ہمہ گیر قبولیت کے باعث، اُس پر ہاتھ ڈالنے کی ہمّت نہ ہوتی تھی۔ گرمی کا زمانہ تھا، شمشاد کی آنکھیں دُکھنے آگئیں، اور اس تکلیف نے یہاں تک طول کھینچا کہ اُسے ضلع کے ہسپتال میں جانا پڑا۔ شمشاد کی غیر موجودگی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے قیصر پُور کے وہ لوگ، اگرچہ معمولی حیثیت کے آدمی تھے، مگر شمشاد کا ہر کام میں ہاتھ بٹاتے تھے، کئی مقدمات میں ماخوذ کرادئے گئے۔ شمشاد کی آنکھیں ابھی پورے طور پر اچھی نہ ہوئی تھیں، لیکن اس خبر کو سُنکر وہ ڈاکٹروں کی ہدایت کے خلاف قیصر پور چلا آیا۔ بہت سے لوگ مختلف الزامات میں پھنسے ہوے تھے، اور ضلع میں اکثر مقدمات کی نوعیت پیچیدہ اور خطرناک ہو گئی تھی، اس لئے، شمشاد کو عظیم گنج میں رہ کر پیروی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اور

اور وہ عظیم گنج چلا آیا۔ شمشاد سمجھتا تھا کہ چند دن میں تمام معاملات سلجھ جائیں گے، مگر اسکی توقع غلط ثابت ہوئی، اور اسے بہت دنوں کے لئے عظیم گنج میں رک جانا پڑا۔ اس مصروفیت نے اس کے اصلاحی پروگرام کو یقیناً نقصان پہونچایا، اسی کی تنہا ذات، اس اسکیم کی روح تھی، اور اب اس روح کو، اپنا جسد کو چھوڑ کر، عظیم گنج میں آجانا پڑا۔

چوری!

عظیم گنج میں ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک سوداگر نے مسافر خانہ تعمیر کرا دیا تھا، جس کے ایک حصہ کو لوگ "ہوٹل" کہتے تھے عظیم گنج کے لئے، یہ عمارت واقعی ہوٹل کی حیثیت رکھتی تھی۔ شمشاد کو مقدمات کے سلسلہ میں، عظیم گنج میں مسلسل رہنا پڑتا تھا، اس لئے اس نے مسافر خانہ کا ایک کمرہ کرایہ پر لیلیا۔ چند دن کے بعد افضل سے شمشاد کی ملاقات ہوئی، اور جب افضل کو یہ معلوم ہوا کہ شمشاد نے مسافر خانہ میں کمرہ کرایہ پر لیا ہے، تو اس نے بہت زیادہ خفگی کا اظہار کیا، اس نے کہا کہ کیا بھائی شمشاد! میں ابھی مرا نہیں ہوں، زندہ ہوں، جب میں مرجاؤں تو پھر سرائے یا ہوٹل میں ٹہرنا یا کسی اور کے یہاں! لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میرے جیتے جی، تم میرے گھر کو چھوڑ کر، اور کہیں قیام کرو، شمشاد نے جواب دیا کہ میں اپنے قصور کی معافی چاہتا ہوں، مگر میاں افضل! مہمانداری، دو چار دن اور زیادہ سے زیادہ ہفتہ دو ہفتہ کی ہوتی ہے، مجھے تو مقدمات کے سلسلہ میں کئی مہینہ یہاں ٹہرنا پڑیگا، تم خود ہی انصاف کر کے بتاؤ کہ اتنے دن تک کی مہمانداری کہانتک مناسب ہے، افضل نے کہا، اجی حضرت! آپ کو مہمان کون مردود سمجھتا ہے، آپ کا گھر ہے مہینہ

دو مہینہ، سال، دو سال جب تک جی چاہے رہیئے، آپ کے لئے کوئی اہتمام تھوڑی کیا جائے گا، اور ہاں! آپ اسی وقت مسافر خانے میرے ساتھ چلئے، میں خود آپ کا اسباب وہاں سے لیکر آؤں گا، افضل اور شمشاد دونوں مسافر خانے پھونچے، اور تھوڑی دیر میں اسباب لیکر واپس ہوگئے، اور شمشاد، افضل کے گھر میں مقیم ہوگیا۔

افضل کے باپ کی آمدنی تو کچھ ایسی زیادہ نہ تھی، مگر اُنھوں نے مکان بہت سلیقہ سے تعمیر کرایا تھا، بات یہہ تھی کہ افضل کے باپ کے یہاں اینٹوں کا بھٹہ تھا، جتنی اینٹیں فروخت ہونے سے بچ رہتی تھیں، اُن کو مکان میں لگا دیا کرتے تھے اس طرح چند سال میں تھوڑا تھوڑا اضافہ ہوتے ہوتے، اچھا خاصہ مکان بن گیا زنانہ میں دوہرے، تہرے دالان تھے، کشادہ کمرے اور لانبا چوڑا صحن! مردانہ حصہ، زنانہ حصہ سے بالکل ملحق تھا، صدر دروازہ بند کرنے پر، مردانہ حصہ بھی، زنانہ حصہ میں شامل ہو جاتا تھا۔

افضل کے مکان کے مردانہ حصہ کی، ایک دیوار، راستہ پر تھی، اور اسی دیوار کے کمرے میں، شمشاد کا اسباب رکھا ہوا تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا، سب لوگ صحن میں سو رہے تھے، چوروں نے اسی کمرے میں نقب لگایا، اور شمشاد کے ٹرنک سے نقدی اور کاغذات نکال کر لے گئے۔ صبح کو شمشاد نے کمرے کو کھولا، تو دیوار میں بڑا سا سوراخ نظر آیا، اُس نے افضل کو آواز دی، افضل دوڑا ہوا آیا، شمشاد نے اپنے ٹرنک کو دیکھا تو اُس کا قفل ٹوٹا ہوا تھا، اور نقدی اور مقدمات کے کاغذات غایب تھے، شمشاد نے تھانہ میں جاکر رپورٹ لکھائی، اور پولس نے تفتیش شروع کر دی۔

قیصرپور میں جب یہہ خبر پہونچی، تو بہت سے لوگ اظہار ہمدردی کے لئے، شمشاد کے پاس آئے، جب لوگوں کو یہہ معلوم ہوا کہ مقدمات کے کاغذات چوری گئے ہیں، تو سب کا خیال قیصرپور کی اُس بدمعاش پارٹی کی طرف گیا، جو شمشاد کی مخالفت تھی۔ پولس نے اتنا تو پتہ لگا لیا تھا کہ قیصرپور کے فلاں فلاں لوگوں نے یہہ سب کچھ کیا ہے، مگر یہہ صرف "تفتیش" تھی، کوئی چیز ایسی برآمد نہیں ہوئی، جس کی بنا پر ملزموں کو پکڑا جا سکے، اور کوئی چیز برآمد بھی کہاں سے ہوتی، کاغذات کو تو اُن لوگوں نے جلادیا تھا، اور پچاس سو روپیہ جو کچھ وہ لوگ چُرا کر لے گئے تھے، وہ کھا پی کر برابر کر دئے، اور اگر وہ روپیہ اُن کے پاس ہوتا بھی، تو روپیوں پر شمشاد نے اپنی مُہر تھوڑی لگادی تھی۔ بُرائی کو کتنا ہی چھپاؤ، ظاہر ہو کر رہتی ہے، شمشاد کے مخالفین نے جب دیکھا کہ پولس تفتیش کے باوجود، ان کو نہ پکڑ سکی، تو اُنھوں نے اپنی خاص صحبتوں میں، اس کامیابی کو فخریہ بیان کرنا شروع کیا۔ قیصرپور کے لوگوں کو یہہ بات بہت بُری معلوم ہوئی، اُنھوں نے پولس والوں سے جاکر کہا کہ ہمارا شبہہ فلاں فلاں لوگوں پر ہے، پولس نے کہا کہ تم میں سے اگر دو، چار شخص گواہی دینے کے لئے تیار ہو جائیں تو ہم ابھی ملزمین کو گرفتار کئے لیتے ہیں، ان لوگوں نے کہا کہ جتنے گواہوں کی ضرورت ہو مل سکتے ہیں۔ پولس کو جب اطمینان ہوگیا تو اُس نے تین آدمیوں کو گرفتار کر کے اُن کا چالان کر دیا۔

مقدمہ شروع ہوا، پولس نے شمشاد سے کہا کہ تمھارا جن لوگوں پر شبہہ ہے اُن کے نام عدالت کے سامنے بیان کر دینا، اور ہاں! تم اتنا اور کہہ دینا کہ میں نے ایک شخص کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا، وہ اُن ہی ملزمین میں سے تھا، شمشاد نے جواب دیا

کہ میں قیامت تک جھوٹ نہیں بھول سکتا۔ نہ میرا کسی پر شبہ ہے اور نہ میں نے
کسی کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ پولس انسپکٹر نے اس پر کہا کہ بھائی! آپ بڑے سیدھے
معلوم ہوتے ہیں، مقدمہ کو اسی طرح بنایا جاتا ہے، شمشاد صاحب! کسی کو جیل بھجوانا
آسان نہیں ہے، بڑی ترکیبوں اور مصلحتوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور یہہ آپ نی جھوٹ
کی بھی ایک ہی کہی بغیر جھوٹ کے تو اس دنیا میں کام ہی نہیں چلتا۔ اور مقدمات
کی ترتیب میں تو تھوڑی بہت رنگ آمیزی کرنی ہی پڑتی ہے۔ میں ایک سچے مقدمہ
ہی کو آپ کے سامنے مثال کے طور پیش کرتا ہوں، اُس سے آپ اندازہ لگالیں گے،
کہ اس دنیا میں سچائی بھی رنگ آمیزی کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔

شمشاد صاحب! جو کچھ میں کہ رہا ہوں، اُسے غور سے سُنیے ـــــ سب انسپکٹر نے کہا
میں بہت غور سے سُن رہا ہوں، آپ فرماتے جائیے ـــــ شمشاد نے جواب دیا
اس پر سب انسپکٹر بولا کہ دیکھئے ایک شخص کو چور راہہ پر، ایک شخص لاٹھی سے
زخمی کر دیتا ہے، تین آدمیوں کو جنہوں نے اس واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، بطور
گواہ کے پیش کیا جاتا ہے۔ یہہ گواہ قانون کی اصطلاح میں رویت کے گواہ عینی شاہد
کہے جاتے ہیں، انکی شہادت بہت وزن رکھتی ہے۔ ان گواہوں کو اگر پہلے سے کوئی
معقول آدمی کچھ نہ بتادے، تو یہہ عدالت میں جاکر ایک ہی واقعہ کو قدرے اختلاف
کیساتھ بیان کریں گے، اور جرح میں تو ضرور مختلف ہو جائیں گے۔ بات یہہ ہے کسی
ایک واقعہ کو جب دو آدمی بیان کریں گے تو الفاظ اور ترتیب بیان میں ضرور اختلاف
ہوگا۔ عام طور پر ایسے واقعات آناً فاناً ظہور میں آجاتے ہیں، اور وہ بھی بالکل ناگہانی اور
اچانک! دیکھنے والے، واقعات کی جزئیات کو اُس ترتیب کیساتھ تو نہیں دیکھتے جنکی

مقدمہ کی ترتیب میں ضرورت پڑتی ہے۔ دیکھنے والوں نے یہہ تو دیکھا ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو لاٹھی سے زخمی کر دیا۔ لیکن اس واقعہ کی ترتیب اُن کے ذہن میں قایم نہیں رہ سکتی، عدالت میں جب اُن کا بیان ہوگا، اور پھر اُس پر جرح ہوگی، تو اُن سے پوچھا جائے گا:—

مجروح، سڑک پر دوکان سے کتنے قدم کے فاصلہ پر کھڑا ہوا تھا۔

مجروح کے سر پر جو پہلی ضرب لگی ہے، تو اُس نے سر کو سہلایا تھا، یا کنپٹی کو —

اور ہاں دیکھو — : ملزم کی شیروانی کی جیب میں کوئی پنسل یا قلم بھی تھا۔

دوسری لاٹھی پر مجروح نے کہا تھا "مجھے بچاؤ" "میں مرگیا"

مجروح کی انگلی پر ایک دھجی بندھی ہوئی تھی، جس کا ایک حصہ لہو سے سُرخ تھا۔

اس واقعہ کے بعد جب چوراہہ پر بہت سے لوگ جمع ہو گئے، تو اُن لوگوں میں سے کسی کے ہاتھ میں تیتروں کا پنجرا بھی تھا۔

اب آپ خود ہی اندازہ لگائیے کہ ایسے سوالات بالکل یکساں جواب وہ تین گواہ کس طرح دے سکتے ہیں، جنھوں نے اس واقعہ کو دیکھا ہے، دوکان اور سڑک کا فاصلہ بتانے میں کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور ہوگا، ذرا سی دیر میں یہہ واقعہ ظہور میں آگیا، اب

اتنی تفصیل اور ترتیب کس کے ذہن میں رہ سکتی ہے، کہ ملزم کی شیروانی کی جیب کے پنسل کو بھی وہ دیکھ لے، اور مجروح کی انگلی کی بندھی ہوئی دھجی پر بھی اُس کی نظر ہو۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ گواہ جاہل ہوتے ہیں، عدالت کے کمرے میں پہونچکر مرعوب اور خوفزدہ ہوجاتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ کسی واقعہ کی تفصیل آپ ہائیکورٹ کے ججوں سے دریافت کیجئے، تو ترتیب میں کچھ نہ کچھ لفظی اختلاف ضرور ہوجائے گا۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ میں ایک واقعہ کو جتنی بار بیان کیا جائے گا، ہر بار کچھ نہ کچھ کمی بیشی ضرور ہوگی ۔

تو جب، جناب مولٰنا قبلہ، صورتِ حال یہ ہے، پھر آپ ذرا سی بات کہتے ہوئے کیوں ہچکچاتے ہیں۔ میں یقین کیساتھ کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے، وہ ہی حقیقی مجرم ہیں، شمشاد نے کہا کہ آپ جانیں، اور آپ کے مقدمہ کی ترتیب! میں کسی طرح جھوٹ نہیں بھول سکتا۔ سب انسپکٹر مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

پولس کی طرف سے جو قیصر پور کے چند آدمی، گواہوں کی حیثیت سے پیش ہونیوالے تھے، اُن سے بھی شمشاد نے کہہ دیا تھا، کہ جو کچھ تم کو معلوم ہو سچ سچ بیان کرنا میری ہمدردی میں اگر ایک لفظ بھی جھوٹ کہا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا، اور پہلی پیشی پر ہی ملزم بری کردئے گئے۔ قیصر پور میں جب اس واقعہ کی خبر پہونچی، اور لوگوں کو اس مقدمہ میں شمشاد کا طرزِ عمل معلوم ہوا تو سب لوگ بیحد متاثر ہوئے، اور اسی ایک واقعہ نے قصبہ کی فضا کو بدل دیا۔ دشمنوں کے دل بھی پسیج گئے، اور مخالفین بھی تعریف کرنے لگے۔ کتنے ہی مقدمات، شمشاد کے مخالفین نے خود ہی اُٹھا لئے۔ مگر چند بدمعاش اب بھی شمشاد کے درپے آزار تھے، اور اُن لوگوں کو جنھوں نے شمشاد کی مخالفت ترک کردی تھی، طعنے دیتے تھے کہ تم

بڑے بزدل اور تھوڑے دل کے ہو، ان لوگوں کی مخالفت کے علاوہ، دو تین مقدموں میں خود سرکار مدعی تھی، اس لئے شمشاد کو عظیم گنج میں ٹھہر جانا پڑا۔

انقلاب انگیز بچپن!

اس واقعہ کے بعد شمشاد کا سامان، افضل کے مکان کے زنانہ حصہ کے ایک کمرے میں، جو بہت محفوظ تھا منتقل کر دیا گیا۔ اور کوئی ایک مہینہ کے بعد، افضل نے شمشاد سے کہا کہ بھئی! اب اس اجنبیت اور مغائرت کو خیر باد کہہ دو، میں اپنے گھر کے لوگوں کو تمہارے سامنے کئے دیتا ہوں، یہہ پردہ آخر کب تک چلے گا؟ میں تم کو اپنے حقیقی بھائی کی مثل سمجھتا ہوں، اور اب یہہ مغائرت برداشت نہیں ہو سکتی۔ شمشاد نے افضل کی اس تجویز کی سختی کیساتھ مخالفت کی، مگر افضل اس تجویز کو پیش کرنے کے بعد، اپنی بات پر اڑ گیا، اور آخر کار ایک دن، افضل کے گھر کے لوگ شمشاد کے سامنے آ گئے۔

افضل کے گھر میں تین عورتیں تھیں، افضل کی بیوی نادرہ، اس کی چھوٹی بہن نور جہاں اور تیسری اس کی بیوہ پھوپھی۔ نور جہاں کی عمر سولہ سال کے قریب تھی، اور ماں، باپ نے اسے بہت ناز و نعم سے پالا تھا۔ نور جہاں اور نادرہ دونوں بہنیں معلوم ہوتی تھیں، اور یہہ عجیب اتفاق تھا کہ دونوں کے چہروں کا کٹ بہت زیادہ ملتا جلتا تھا، نادرہ کا رنگ البتہ زیادہ کھلتا ہوا تھا، اور جسم بہت زیادہ گداز۔ نور جہاں کا رنگ گندمی تھا، جسم دبلا، پتلا، شوخ و طرار، بہت جلد بے تکلف ہو جانے والی! نور جہاں کے چہرے پر بلا کی بھبن تھی، اور مسکراتے وقت تو وہ سچ مچ کنول کا پھول بن جاتی تھی، نور جہاں

سرتا بقدم لطافت و نزاکت تھی، اور لوگ اُس سے ایکبار مل کر، دوبارہ ملنے کی تمنا کرتے تھے۔

نورجہاں اس کمسنی میں انقلابات کی زندہ تاریخ تھی، وہ اُس کو غیر شعوری طور پر حوادث و انقلابات کی پُر خار وادیوں سے گذرنا پڑا تھا۔ نورجہاں کی عمر چار سال کے قریب تھی، کہ اس کے ماموں، اُسے اپنے گھر لے گئے۔ نورجہاں کے ماموں احمد حسین خاں گاؤں میں رہتے تھے، اور روئی کے بہت بڑے تاجر تھے۔ گاؤں کے قریب اُنھوں نے روئی کی گرنی قایم کی تھی، آس پاس کے دیہات کی تمام کپاس، اس گرنی میں آتی تھی، احمد حسین خاں، اس علاقہ کے سب سے زیادہ مالدار تاجر تھے، اور اُن کی دولت کے قصے گاؤں والوں میں عجیب عجیب طریقہ سے مشہور تھے، کوئی کہتا تھا کہ جب ان کا مکان تعمیر ہو رہا تھا تو پُرانے مکان کی بُنیادوں میں، اشرفیوں سے بھری ہوئی دیگ مل گئی، کوئی کہتا تھا کہ بمبئی کے مسافرخانہ میں کوئی مسافر اپنا ہینڈ بیگ چھوڑ کر چلا گیا، احمد حسین خاں اُس ہینڈ بیگ کو اپنے ساتھ لے آئے، اب جو گھر آکر اُسے کھولا تو پورا ہینڈ بیگ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا، بس اُسی دن سے اُن کے دن پھر گئے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ ایک پہونچے ہوئے فقیر نے احمد حسین خاں کو ایک ایسا عمل بتا دیا تھا کہ صُبح کو اُن کے تکیہ کے نیچے سو روپیہ رکھے ہوئے ملتے تھے۔ گاؤں کے لوگ تجارت کی ترقی کے راز سے واقف نہیں ہوتے، اُن بیچاروں کی دُنیا تو چند بیگھے زمین اور دو چار بیل ہوتے ہیں، جب وہ کسی مالدار کو دیکھتے ہیں، یا اُنکے دیکھتے دیکھتے کوئی غریب آدمی، مالدار بن جاتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ اس کو کہیں غیب سے دولت مل گئی ہے۔

گرمیوں کا زمانہ تھا، نورجہاں کے ماموں احمد حسین خاں کی گرنی بند پڑی ہوئی تھی، گرنی کے چند مستقل ملازم گرنی کی صفائی میں مشغول تھے، گاؤں سے ایک بہت بڑی بارات کسی دوسرے گاؤں میں گئی ہوئی تھی، اس موقعہ سے فایدہ اٹھاتے ہوئے، احمد حسین خاں کے مکان پر رات میں ڈاکو چڑھ آئے۔ گاؤں بھر میں احمد حسین خاں کے پاس ہی بندوقیں تھیں، ڈاکوؤں نے آتے ہی بندوقوں پر قبضہ کر لیا، احمد حسین خاں، نورجہاں کو بہت چاہتے تھے، اور اُسے اپنے پاس ہی سُلاتے تھے، ڈاکوؤں کو دیکھ کر، احمد حسین خان نے چلانا شروع کیا، اس پر ایک ڈاکو نے احمد حسین پر گولی چلادی، رائفل کی گولی، اور وہ بھی چند قدم کے فاصلہ سے چلائی گئی تھی، احمد حسین خان گولی کھاتے ہی تڑپے اور نورجہاں کے ہلکے پھلکے بدن پر گر کر ختم ہو گئے، نورجہاں کی بساط ہی کیا تھی، ڈیڑھ من وزن کو کیا سنبھال سکتی تھی، وہ بھی اس صدمہ سے بیہوش ہو گئی، اور ڈاکوؤں کے جانے کے بعد جب لوگوں نے اُسے لاش کے نیچے سے اُٹھایا ہے، تو اس کے تمام کپڑے خون میں لت پت تھے، گاؤں میں یہہ بات قصہ کے طور پر مشہور تھی کہ احمد حسین خان نے بھانجی کو بچانے کے لئے اپنی جان دیدی۔

نورجہاں کوئی چھ، سات سال کی تھی، کہ اس کو اپنی ماں کیساتھ، کسی گاؤں میں جانا پڑا۔ کچا راستہ تھا، ایک چھوٹی سی ندی کو پار کر کے اس گاؤں میں جانا پڑتا تھا، گرمی کے دنوں میں عام طور پر ہندوستان کی ندیوں کا پانی کم ہو جاتا ہے، اور چھوٹی ندیوں سے تو لوگ ناؤ کے بغیر ہی گذر جاتے ہیں، نورجہاں اپنی ماں کیساتھ، جس گاڑی میں بیٹھی ہوئی۔ ندی کو پار

کر رہی تھی، بیچ ندی میں اُس گاڑی کا پہیہ ٹوٹ گیا، گاڑی کو زور سے دھکا لگا، اور نور جہاں اُچھل کر پانی میں گر پڑی، نور جہاں کی ماں نے شور مچانا شروع کیا کہ میری بچی کو بچاؤ، گاڑی بانوں کو وکر، نور جہاں کو پانی سے نکالا وہ کئی ڈبکیاں کھا چکی تھی، اور اُس پر نیم بیہوشی طاری ہو چکی تھی،

نور جہاں کے ماموں جن کا ابھی ذکر ہو چکا ہے، نور جہاں سے بیحد محبت کرتے تھے، ایک مرتبہ وہ جنگل میں ہرن کا شکار کرنے کے لئے گئے اور نور جہاں کو بھی اپنے ساتھ لیلیا۔ چھوٹی چھوٹی خوبصورت گاڑیاں جن کو گاؤں والے "ریلو" کہتے ہیں، گاؤں والوں کے لئے موٹروں سے زیادہ کارآمد ہوتی ہیں۔ احمد حسین خاں کے ساتھ شکار میں دو ریلو تھے، ایک میں تو وہ، انکی نور جہاں اور اُن کے دو دوست بیٹھے ہوئے تھے، اور دوسرے ریلو میں ملازمین تھے، ملازمین کے ریلو میں دو اور احمد حسین خاں کے ریلو میں تین بندوقیں تھیں راستہ میں ہرن نظر آئے اور نور جہاں کے ماموں احمد حسین خاں نے فائر کر دیا ہرن بھاگ نکلے، ایک ہرن کچھ دور لنگڑاتا ہوا بھاگا، اور جھاڑیوں میں گر پڑا، ملازمین دوڑے، اور ہرن کو ذبح کر کے اٹھا لائے، ہرن کو ملازمین نے اپنے تانگے (ریلو کو تانگہ بھی کہتے ہیں) میں رکھہ لیا، یہہ چور اور شکاری شگون لینے کے بہت عادی ہوتے ہیں، چوروں کے متعلق مشہور ہے کہ رات کو جب گھروں سے چوری کرنے کے لئے نکلتے ہیں، تو ایسے راستہ سے جانے کی کوشش کرتے ہیں، جہاں درخت بہت ہی کم ہوں، کیوں کہ اگر کسی درخت سے اُلّو کی آواز ان کے کان میں آگئی، توان کا شگون بگڑ جاتا ہے، اور یہہ

چوری کرنے کا ارادہ بدل دیتے ہیں، ایسے ہی شکاری بھی شگون پرست ہوتے ہیں، جب یہہ شکار کے لئے جا رہے ہوں اور کوئی عورت اُن کے سامنے سے خالی گھڑا لیکر نکل جائے تو یہہ بہت بُرا مانتے ہیں۔ گھر سے چلتے وقت، یا راستہ میں کوئی شکاری "چاقو" یا "چھُری" کا نام زبان سے نہیں لیتا، جب ضرورت پڑتی ہے تو اشارے سے بتاتے ہیں، اگر کوئی اناڑی شکاری چاقو اور چھُری کہہ دے، تو اُس کے ساتھی بہت بُرا بھلا کہتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ آج شکار نہیں ملیگا۔ احمد حسین خان کے مُلازم نے، گاؤں سے تھوڑی دور نکل کر کہا کہ سرکار! میں چاقو بھول آیا، چاقو لے آؤں، احمد حسین خان نے نوکر کو بہت بُرا بھلا کہا، اور اپنے ساتھیوں سے بولے کہ خدا ہی ہے جو آج شکار مل جائے!

ہرن کو تانگے میں رکھنے کے بعد، دونوں تانگے روانہ ہو گئے، تھوڑی دور جا کر نیل گائے نظر آئی، احمد حسین خان اپنے دوستوں کیساتھ بندوق لئے ہوئے اُترے، نور جہاں کے پاس ایک مُلازم کو بٹھا دیا، یہہ لوگ نیل گائے کے تعاقب میں روانہ ہوگئے، اور ایک چیتا قریب کی جھاڑی سے، ہرن کی بُو پاکر، تانگوں کے قریب آگیا۔ ملازم نے چیتے کو دیکھ کر شور مچایا، اور نور جہاں بھی بے تحاشہ چیخنے لگی، اتنے میں احمد حسین خاں نے نیل گائے پر گولی چلائی، چیتا گولی کی آواز سُنکر گھبرایا، اور ملازم اور نور جہاں پر حملہ کرتا ہوا نکل گیا، ملازم کا سر اور شانہ بُری طرح زخمی ہوا، نور جہاں جھکی ہوئی بیٹھی تھی، چیتے کا ناخن، اُسکی گردن سے چھو گیا، اور اسکی گردن سے لہو بہنے لگا۔

چیتے کے ناخن کا نشان اُسکی گردن پر اب تک موجود تھا، اور وہ اپنی سہیلیوں میں فخر کیساتھ کہا کرتی تھی کہ میں نے بچپن میں شیروں اور چیتوں سے جنگ کی ہے۔ نورجہاں کی زندگی کے ان حالات نے اس میں جُراءت اور بیباکی پیدا کر دی تھی، اور عام طور پر کنواری لڑکیاں چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ڈر جاتی ہیں مگر نورجہاں بہادر اور جری تھی!

اقدامِ محبت

ابتدا میں نوشمشاد، اپنے دوست افضل کے گھر والوں سے بڑے احتیاط اور شرم کیساتھ ملتا تھا، لیکن آہستہ آہستہ مغایرت جاتی رہی، اور بے تکلفی ہوگئی۔ لیکن اس بے تکلفی سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ عورتوں کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کرتا تھا، صرف اتنا ہوا کہ وہ تھوڑی بہت دیر زنانہ میں بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا، اور پہلے کی طرح جھینپ کر، شرما کر اور نیچی نظریں کر کے نہیں، بلکہ خوب کھُل کر، گفتگو میں حصہ لیتا۔

بھاوج، ساس اور نند کی لڑائی، ہندوستان کی معاشرت میں اس طرح گھل مل گئی ہے کہ اُسے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں کسی شوہر نے بیوی کی نازبرداری کی، یا کسی مسئلہ میں بیوی کی رائے سے اتفاق کیا، یا ہمدردی ظاہر کی، تو اُس کی ماں اور بہنیں خفا ہوگئیں کہ لڑکا جورو کا غلام ہو گیا ہے۔ ماں اور بہنوں کو کچھ نہیں سمجھتا۔ ماں اور بہنوں کی کسی بات میں تائید

کی جاتی ہے تو بیوی ناک بھوں چڑھانے لگتی ہے کہ مجھے باندی اور ماما سمجھ رکھا ہے، میری کوئی بات نہیں چلتی۔ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں مل کر، ایک مستقل عداوت اور مخاصمت بن جاتی ہیں۔ اور یہہ جنگ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ مرد کو دو تیروں کا نشانہ بننا پڑتا ہے، اور جس کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے، دوسرا فریق اُس سے ناراض ہو جاتا ہے، تو ہوتا یہ ہے کہ آج بیوی ناراض ہے تو ماں اور بہنیں خوش ہیں، ماں اور بہنیں ناراض ہیں، تو بیوی کا چہرہ خوشی سے چمک رہا ہے۔ ہر گھر ان معاشرتی جنگوں کا میدان بنا ہوا ہے، اور بڑے بڑے عقلمند اس چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔

افضل کے یہاں تعلقات کی یہہ کشیدگی نہیں پائی جاتی تھی۔ بات یہہ تھی کہ افضل کی بیوی نادرہ کو ساس سے واسطہ ہی نہیں پڑا، افضل کی بیوہ پھوپھی خود ہی معذور تھی، اور زندگی کے دن کاٹ رہی تھی، نورجہاں کی انتہائی نیک دل اور شریف تھی، اُس نے بھاوج اور نند، بہن اور بھائی شوہر اور بیوی کے رشتوں کی اہمیت اور نزاکت پر کبھی غور ہی نہیں کیا پھر نادرہ کے طرز عمل نے اس کو بہت زیادہ گرویدہ بنا لیا تھا، اور وہ چاہتی تھی کہ بھائی کی تمام ہمدردیاں نادرہ کے لئے ہی وقف ہو جائیں، جب کبھی کسی بات پر نادرہ اور افضل میں اختلاف ہوتا تو نورجہاں بھاوج کی تائید کرتی افضل کہا کرتا تھا کہ نادرہ نے نورجہاں پر جادو کر دیا ہے۔ افضل کا یہہ جملہ طنز آمیز تھا، مگر اُس نے جو کچھ کہا، سچ کہا، محبت اور خلوص جادو نہیں تو اور کیا ہے، اسی محبت اور پیار کے سلوک کی بدولت ہم نے شیروں

کے منہ میں لوگوں کو ہاتھ دیتے اور سانپوں کے پھنوں سے کھیلتا دیکھا ہے۔ افضل کی گھریلو زندگی نہایت خوشگوار اور فتنہ و فساد سے پاک تھی، وہ بہت مطمئن تھا، اور خوب مزے کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

شمشاد کو یوں تو، افضل کے گھر کے تمام لوگ چاہتے تھے، مگر نورجہاں کو اس سے خاص دلچسپی تھی، شمشاد کے کچہری سے آنے کا شدت کیساتھ انتظار کرتی، اور اس کے گھر سے جاتے وقت ایک خاص تاثر اس کے چہرے پر پایا جاتا تھا۔ نورجہاں، شمشاد کی ہر بات کا خیال رکھتی اور شمشاد کی ایسی ادا شناس ہوگئی تھی کہ شمشاد کے منہ سے بات نکلنے سے پہلے، سمجھ جاتی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ شمشاد کو شامی کباب بہت پسند تھے، نورجہاں، ہفتہ میں کئی کئی بار شامی کباب تیار کراتی، اور ہاں! ماما تو برائے نام شامی کباب تیار کرتی تھی، کبابوں کی تیاری میں نورجہاں کا سارا دخل ہوتا تھا۔ ماما بہت سے بہت اتنا کرتی کہ مسالہ پیس دیا، چولھے میں آگ سلگادی، نورجہاں گرمی کے مہینہ میں ٹھیک اس وقت جبکہ چیل انڈا چھوڑتی ہے، خون پسینہ ایک کرکے شمشاد کے لئے کباب تیار کرتی۔ ایک دن وہ باورچی خانہ سے کباب بناکر نکلی، خوب گرمی پڑ رہی تھی، شمشاد اس دن کچہری سے پیشی تبدیل کراکے بہت جلد آگیا، نورجہاں کے بال بکھرے ہوئے تھے، چہرہ آگ اور گرمی کے مارے تمتمایا ہوا تھا، دوپٹہ سر سے ڈھلک کر شانوں پر آگیا تھا، انگلیاں گھی اور مسالہ میں سنی ہوئی تھیں۔

یہ تمھاری حالت کیا ہو رہی ہے ـــــــ شمشاد نے برآمدے سے آواز دی۔

آپ ہی کے لئے تو کباب بناکر آئی ہوں، یہ آپ کا

شامی کبابوں کا شوق، مجھے تباہ کر کے رہے گا ـــــ نور جہاں نے جواب دیا۔

تو آج سے شامی کبابوں کا بائیکاٹ! ـــــ شمشاد، انتہائی سنجیدگی

کیساتھ بولا۔

یہ بائیکاٹ کی آپ کو بہت بے وقت سوجھی۔ نور جہاں نے ہنستے

ہوئے کہا۔

تم نے ابھی ابھی تو کہا ہے کہ آپ کے شامی کبابوں

کا شوق، مجھے تباہ کر کے رہے گا، تو میں تم کو اپنے شوق کے

پیچھے تباہ کرنا نہیں چاہتا ـــــــــــ شمشاد نے جواب دیا۔

میں نے تو مذاق سے کہہ دیا ہے، آپ نے سچ

سمجھ لیا، شامی کباب تو مجھے خود بہت زیادہ پسند ہیں، جس دن

دسترخوان پر کباب نہیں ہوتے، ایک دو چپاتی کم کھاتی ہوں

لیکن مجھے اپنی پسند پر مسرت ہے کہ اس معاملہ میں میری اور

آپ کی پسند متفق ہے ـــــــــــــ نور جہاں نے انگلیاں

ملتے ہوئے کہا۔

اتنے میں نادرہ غسل خانہ سے نکل کر آگئی، اور نور جہاں ہاتھ دھونے لگی۔ کھانا

کھانیکے بعد، شمشاد اپنے کمرے میں چلا گیا، نور جہاں اور نادرہ ایک کمرے میں لیٹ گئیں

نادرہ کی آنکھ بہت جلد لگ گئی، نور جہاں کروٹیں بدلتی رہی، اور آخر کار اٹھ کر بیٹھ گئی

اور دل ہی دل میں کہنے لگی:-

میرا اس وقت جانا اُن کو ناگوار ہوگا، وہ سو رہے ہوں گے،

اور بھابی جان کی آنکھ کھل گئی، تو نہ جانے! وہ کیا خیال کریں گی۔!
مگر وہ مجھ سے ناخوش نہیں ہو سکتے، اور بھابی جان کیوں کچھ خیال
کرنے لگیں، لاحول ولاقوۃ! بعض وقت میں کتنی بدگمان اور وہم پرست
بنجاتی ہوں ــــــــــــ

نور جہاں نے پلنگ سے اُٹھ کر، تصویروں کا البم ہاتھ میں لیا، اور شمشاد کے
کمرے میں پہونچ گئی، شمشاد مسہری پر خوب گہری نیند سو رہا تھا۔ نور جہاں نے جوتوں کو
فرش پر رگڑا، مگر شمشاد کو یہہ دھیمی سی آواز کب جگا سکتی تھی۔ نور جہاں نے شمشاد کے
سرہانے بیٹھ کر کتاب کے اوراق خوب تیزی کیساتھ پلٹنے شروع کئے تھوڑی دیر میں شمشاد
کی آنکھ کھل گئی۔

ارے! نور جہاں، تم، یہاں کب سے بیٹھی ہوئی ہو۔ شمشاد نے آنکھیں
ملتے ہوئے کہا۔

مجھے آئے ہوئے مشکل سے دو تین منٹ ہوئے
ہوں گے ــــــــــــ نور جہاں نے جواب دیا

کسی خاص کام سے آئی ہو، یہہ تو تمھارا سونے
کا وقت ہے ــــــــــــ شمشاد نے دریافت کیا

کوئی خاص کام تو نہیں ہے، بھابی جان پلنگ پر
پڑتے ہی سوگئیں مجھے نیند نہ آئی، اکیلی پڑی ہوئی کیا کرتی،
سوچا کہ آپ ہی کے پاس کچھ دیر بیٹھونگی ــــــــــــ نور جہاں بولی۔

شمشاد نے اُٹھ کر منہ دھویا، اور تھوڑی سی دیر میں، واپس آگیا، نور جہاں نے

تصویروں کا البم دیتے ہوئے، شمشاد سے کہا۔ لیجئے! آج آپ کے حسنِ انتخاب کا امتحان ہے، ان تصویروں کو بغور دیکھ کر بتائیے کہ آپ کو کونسی تصویر پسند ہے۔ شمشاد نے البم کو کھولا، اور پہلی ہی تصویر کو دیکھ کر بولا:۔

آپ کے بیٹھنے کا کوئی انداز تو دیکھئے، سبحان اللہ!

خوبصورتی اور بناوٹ دو متضاد چیزیں ہیں۔

تو آپ کو یہ تصویر پسند نہیں ہے، مگر اس کی

آنکھیں تو بہت اچھی ہیں ——— نورجہاں نے کہا۔

آنکھوں کا لیکر کوئی کیا کریگا، ذرا دہانہ کے عرض

وطول کو تو ملاحظہ فرمائیے۔ اور ہاں! ناک کا خم —!

دیکھئے! اور اپنی قسمت کو روئیے ——— شمشاد نے ہنس کر

جواب دیا۔

اچھا۔ تو آگے چلئے۔! ایک ایک تصویر پر اتنی

بحث ہوگی، تو شام ہو جائے گی۔

نورجہاں نے البم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، اور شمشاد نے ورق الٹ دیا۔ شمشاد نے تصویروں پر تنقید شروع کی:۔

گردن بہت اچھی ہے، مگر اس کے ہونٹ کہاں

جا رہے ہیں،

آنکھ میں مستی نہیں، چہرے پہ گولائی نہیں
اس لئے، تصویرِ جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں } بھی — ۱۵

بہت خوب! مگر ہاں! ذرا آنکھیں اور بڑی ہونی چاہیئے تھیں۔

یہہ تو مصور کا کمال معلوم ہوتا ہے، اتنے حسین بال کسی کے کہاں ہوتے ہیں ـــــــ

عمر زیادہ معلوم ہوتی ہے، صورت بری نہیں ہے، آنکھوں میں کشش پائی جاتی ہے ـــــــ

نور جہاں، شمشاد کے چہرے کا بغور مطالعہ کر رہی تھی، اور شمشاد بالکل ڈوب کر، تصویریں دیکھ رہا تھا، شمشاد نے البم کی تمام تصویریں دیکھنے کے بعد، ایک تصویر، نور جہاں کو دکھاتے ہوئے کہا:۔

یہہ تصویر سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ ناک نقشہ کتنا موزوں ہے، اور آنکھیں تو اس نے غضب کی پائی ہیں، سادگی، بھولاپن، کشش! اور کیا چاہیئے ـــــــ

تو یہہ عورت آپ کو پسند ہے ـــــــ نور جہاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

جو تصویریں تم نے مجھے دیکھنے کے لئے دی ہیں، ان میں یہہ تصویر سب سے اچھی ہے ـــــــ شمشاد نے جواب دیا

کل میں نے ایک افسانہ پڑھا تھا، اس میں لکھا تھا کہ مرد، بہت حسن پرست ہوتے ہیں، یہی دیکھنے کے لئے میں نے البم کی تصویروں میں سب سے اچھی تصویر کا آپ سے انتخاب کرایا کہ دیکھوں! آپ کتنے پانی میں ہیں۔ نور جہاں خاص انداز

کیسانھ ہنستے ہوئے بولی

خوبصورتی تو مرد اور عورت دونوں کو پسند ہے"

اور ـــــــــــــ

اتنے میں باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی، اور نورجہاں اُٹھ کر چلی گئی ـ شمشاد مقدمہ کی مثل (   ) دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ شمشاد کے لئے آج کی گفتگو اگرچہ بالکل نئی قسم کی تھی، مگر اُس نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ نورجہاں نے البتہ اس مکالمہ پر تنہائی میں تبصرہ کیا:۔

شمشاد مجھے تو نہیں معلوم ہوتا۔ خوبصورتی کی وہ قدر کرتا ہے، اور شکل وصورت کے انتخاب میں، خاص سلیقہ رکھتا ہے۔ مگر وہ اتنا خشک کیوں واقع ہوا ہے، اس کو ہمارے یہاں رہتے ہوئے کتنے دن ہو گئے، لیکن اُس نے کسی ہنسی مذاق کی بات میں پہل نہیں کی ـــ شاید وہ بے تکلف ہوتے ہوئے شرماتا ہے، مگر ایسی بھی کیا شرم ہے ـــ لیکن وہ حساس ضرور ہے، اور شاید بہت کچھ سمجھتا ہے، اظہار نہیں کرتا ـــــــــــــ

نورجہاں کی ہمدردیاں بڑھتی جا رہی تھیں، اور اُس کا برتاؤ، شمشاد کیسانھ بہت زیادہ محبت آمیز ہوتا جا رہا تھا۔ شمشاد ایک دفعہ بیمار ہو گیا، بیماری کی ابتدا معمولی زکام اور بخار سے ہوئی، مگر اسی زمانہ میں مقدمات کی پیروی میں اُس کو ہمہ تن مصروف رہنا پڑا، وقت بیوقت کھانا ملا، اویر سویر سویا، بخار بڑھ گیا، اور شمشاد کو فریش ہو جانا پڑا۔ نورجہاں سارے سارے دن شمشاد کے پلنگ کی پٹی سے لگی بیٹھی

رہتی، دوا پلاتی، مُنہ دُھلاتی، تسلّی کی باتیں کرتی۔ شمشاد اُسکی ہمدردی سے بہت متاثر ہوا، ایک دن شب میں شمشاد کے سر میں بہت زیادہ درد تھا، وہ درد کی شدت سے بے تاب ہوکر کراہنے لگا، گھر کے سب لوگ شمشاد کے کمرے میں آگئے، افضل اپنے دوست کا سر دبانے لگا، اور تسلّی دینے کے لئے کہتا جاتا تھا۔

بھئی! شمشاد! ذرا سے درد میں بے چین ہو جاتے ہو۔ میں نے جو گولی تم کو دی ہے، اس کے اثر سے اللہ نے چاہا تو ابھی درد بند ہوا جاتا ہے — میں نے سُنا ہے کہ تم آج دن بھر کتاب پڑھتے رہے، بس یہہ اُسی کا اثر ہے، اتنا زیادہ مطالعہ نہ کیا کرو ——

شمشاد اس پر ہمت کر کے مُسکرایا اور پھر باوجود ضبط کے کراہ نکل گئی، نورجہاں کی آنکھیں بے اختیار نمناک ہوگئیں، اور وہ آنسو پونچھنے کے لئے باہر چلی گئی، شمشاد چند دن میں اچھا ہوگیا، مگر ابھی کمزوری باقی تھی، ڈاکٹر نے اُسے کچھ دن آرام لینے کا مشورہ دیا۔ افضل نے کچہری میں جاکر مقدمات کی پیشیاں ملتوی کرادیں۔

ایک دن شمشاد اور نورجہاں تنہا کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، نورجہاں نے ناگپوری سنترے کی قاشیں چھیل کر، شمشاد کے سامنے پلیٹ میں رکھہ دیں، شمشاد سنترے کی پھانکیں کھانے لگا۔

بیماری کے بعد بہت سے آدمی بہت زیادہ خوبصورت ہو جاتے ہیں —— نورجہاں سنگترے کا چھلکا رُخساروں سے رگڑتے ہوئے بولی۔

ہو جاتے ہوں گے، ہم نے تو اس کا تجربہ نہیں کیا۔ شمشاد نے بے پروائی کیساتھ جواب دیا۔

آپ سے بھی بہت بننا آتا ہے، آپ نے بیماری سے اُٹھنے کے بعد، اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھا بھی ہے ــــ نور جہاں نے کہا۔

جی ہاں! دیکھا ہے، مگر میں تو کوئی تبدیلی محسوس نہیں کرتا، سوائے اس کے کہ میرے رُخسار پچک گئے ہیں اور چہرہ اُترا ہوا سا معلوم ہوتا ہے ــــــــ شمشاد نے جواب دیا۔

انکسار کی بھی حد ہوگئی ــ! اچھا صاحب! آپ بیمار ہوکر بدصورت ہوگئے ہیں، آپ کا ناک نقشہ بدل گیا ہے، آپ پہلے کی طرح خوبصورت نہیں رہے ــــــ نور جہاں بولی۔

یعنی! میں کبھی خوبصورت بھی تھا ــــــ شمشاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

آپ ہمیشہ سے خوبصورت ہیں ـــــــ نور جہاں نے شمشاد کیطرف غور سے دیکھتے ہوئے جوابدیا

نور جہاں! تم سے آدمی کو خوب بنانا آتا ہے، میں اور خوبصورت ــ! اتنے موٹے ہونٹ اور اتنی لانبی ناک والا آدمی کہیں خوبصورت ہوسکتا ہے ــــــ شمشاد بولا۔

میری نگاہ میں تو آپ واقعی خوبصورت ہیں، وجاہت دلکشی بھین، یہہ تمام باتیں آپ میں پائی جاتی ہیں ــــــــ

شمشاد نے نورجہاں کی باتوں کو حیرت کیساتھ سُنا، اور اُس نے فوراً ہی گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

نورجہاں! تمھارے والد کا جب انتقال ہوا ہے تو تمھاری عُمر کیا تھی ——— شمشاد نے دریافت کیا

میں بارہ سال کی تھی ——— نورجہاں نے جوابدیا

تمھارے والد، اللہ اُن کو جنّت نصیب کرے تھے بڑی ملنسار اور متواضع! مجھ سے بڑی محبت کیساتھ پیش آتے تھے، ایک مرتبہ میں اُن سے ملنے کے لئے آیا، گرمیوں کا زمانہ تھا۔ بڑے زور کی لُو چل رہی تھی، میں نے مرحوم سے کہا کہ نوکر سے پانی منگوا دیجئے اُنہوں نے آواز دی، اور پھر جب کوئی جواب نہ ملا، تو خود ہی بولے میں نے نوکر کو تو ڈاک خانے بھیجدیا ہے۔ یہہ کہہ کر وہ اُٹھے اور باہر چلے گئے، میں سمجھا کہ کسی اپنے کام سے گئے ہیں، تھوڑی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ شیخ جی برف لئے چلے آرہے ہیں، نورجہاں! سچ جانو، میں شرم کے مارے پانی پانی ہوگیا۔ ایسے لوگ دُنیا میں روز روز تھوڑی پیدا ہوتے ہیں۔ افضل بھی اپنے باپ کو پڑا ہے بہت سی باتیں شیخ صاحب مرحوم سے ملتی ہوئی ہیں۔

شمشاد کی موضوع سے ہٹی ہوئی گفتگو کو، نورجہاں نے بے دلی کیساتھ سُنا، باپ کی تعریف ہر بیٹے اور بیٹی کو اچھی معلوم ہوتی ہے، لیکن نورجہاں، باپ کی تعریف میں اسوقت کوئی قصیدہ سُننے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اُس نے تھوڑی دیر سکوت

کے بعد کہا:۔

میری بات کا تو آپ نے جواب دیا ہی نہیں، دوسری بات چھیڑ دی، خوبصورت آدمی، شرما بھی تو جاتے ہیں، شائد اسی لئے آپ نے گفتگو کا موضوع بدل دیا ——

اس پر شمشاد بولا:۔

یہہ تم نے آج نور جہاں! خوبصورتی اور بدصورتی کا جھگڑا بلا وجہ کیوں کھڑا کر دیا، کوئی کام کی بات کرو، اچھا یہہ تو بتاؤ، تم کو اپنے ابّا سے زیادہ محبت تھی یا اماں سے —— !

نور جہاں نے اس کے جواب میں جھیں بہ جبیں ہو کر کہا:۔

دونوں سے محبت تھی ۔

شمشاد نے اس پر کہا:۔

میں نے تو سنا ہے کہ لڑکیوں کو ماں سے زیادہ محبت ہوتی ہے، میں یہی بات پوچھنا چاہتا ہوں ——

نور جہاں کے لب پورے طور پر ملنے بھی نہ پائے تھے کہ جھوکرے نے آکر کہا، کہ بیگم صاحبہ آپ کو بلا رہی ہیں، کوئی ضروری کام ہے ۔ نور جہاں اُٹھ کر چلی گئی ۔ شمشاد آج گفتگو کو سن کر سوچ میں پڑ گیا، وہ بہت دیر تک غور کرتا رہا، اور اسی حالت میں اُس کو نیند آگئی ۔

اس گفتگو کے بعد، شمشاد، نور جہاں سے ملتے ہوئے کترانے لگا، وہ نور جہاں کو تنہائی میں اپنے پاس آنے کا بہت ہی کم موقعہ دیتا تھا۔ شمشاد جتنی زیادہ احتیاط برتتا

تھا، نورجہاں اتنی ہی زیادہ قریب اور بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی تھی۔ شمشاد کا احتیاط اور سکوت، نورجہاں کی متوحش حرکات، ان تمام باتوں نے گھر والوں کی توجہ کو چونکا دیا۔ اور نادرہ دونوں کی حرکات وسکنات کا گہری نگاہوں سے مطالعہ کرنے لگی۔ شمشاد، کچہری کے کام سے فارغ ہوکر شہر میں کسی دوست کے یہاں چلا جاتا، یا افضل کے پاس دوکان پر آبیٹھتا، اور اکثر و بیشتر مکان ایسے وقت پہونچتا کہ کھانے کے لئے سب لوگ منتظر ہوں، افضل بھی اُس وقت تک آجاتا تھا، کھانے کے بعد اِدہر اُدھر کی بات چیت ہوتی اور سب لوگ سو جاتے۔

ایک دن صبح کا وقت زنانہ کے برآمدے میں، شمشاد چوکی کے قریب کھڑا ہوا، گلاس کھنگال رہا تھا، شمشاد کے ہاتھ سے گلاس فرش پر گر کر چھن سے ٹوٹ گیا اور شیشہ کا ایک ٹکڑا اس کے پیر میں چبھ گیا، گلاس کے گر کر ٹوٹنے کی آواز سُن کر سب لوگ متوجہ ہوگئے، نورجہاں نے دیکھا کہ شمشاد جُھک کر پیر کو سہلا رہا ہے، اور پتھر پر سُرخی مائل پانی بہ رہا ہے، وہ دوڑی ہوئی آئی، اور یہہ دیکھ کر شمشاد کے پیر سے لہو بہ رہا ہے، اُس نے جُھک کر اپنے ڈوپٹہ کو پانی میں بھگویا اور زخم پر رکھہ دیا۔ چوٹ تو زیادہ نہیں لگی تھی، لیکن جوان آدمی کی رگ خون بہانے میں بڑی فیاض ہوتی ہے، نورجہاں کے دوپٹہ کا پلّو لہو میں تر بتر ہوگیا۔ نادرہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئی، اُس نے دیکھا کہ نورجہاں دوپٹہ کے پلّو کو ان کے پیر پر رکھے ہوئے بیٹھی ہے۔

بھائی جان! کیا ہوا ــــــــ نادرہ نے دریافت کیا

کچھ نہیں! گلاس میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا، اس کا

اس کا شیشہ پیر میں چبھ جانے کے سبب خون نکل آیا۔

تھوڑی دیر میں خون بند ہو گیا، اور زخم پر دھجی باندھ دی گئی، شمشاد تانگے میں بیٹھ کر کچہری چلا گیا، دوپہر کو، جب نادرہ اور نورجہاں گھر کے کام سے فارغ ہو کر، آرام کرنے کے لئے لیٹیں، تو نادرہ نے نورجہاں سے کہا:۔

نورجہاں۔ ! تم نے اتنے قیمتی دوپٹہ کو خاک میں ملا دیا، ایسی ہی ہمدردی کرنی تھی تو گھر میں بیسیوں کپڑے تھے، میں نے دوپٹہ کی کور کس محنت سے تیار کی تھی ۔۔۔ !

اس پر نورجہاں بولی:۔

بھابی جان ! واقعی مجھ سے چوک ہو گئی، مگر میں کیا کروں، شمشاد صاحب کے پیر کو لہولہان دیکھ کر، مجھ سے نہ رہا گیا، اور میں نے بالکل بے اختیاری کے عالم میں اُن کے زخم پر دوپٹہ کا پلّو رکھ دیا۔

نادرہ نے اس کے جواب میں کہا:۔

نورجہاں۔ ! تمھاری اس "بے اختیاری" کا تو میں بہت دن سے مطالعہ کر رہی ہوں، اور اب یہ بے اختیاری بڑھتی جا رہی ہے۔ دیکھو ! میں تم کو آگاہ کرتی ہوں، کہ شمشاد سے زیادہ گھل مل کر بات چیت نہ کیا کرو، زمانہ خراب ہے، لوگ ذرا سی بات کو نمک مرچ لگا کر کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔

نورجہاں، نادرہ کی اس گفتگو پر گھبرا گئی، اُس نے ذرا سی دیر میں کئی

مرتبہ ہونٹوں پر جو خشک ہو لئے، زبان پھیری، اور لمبی منٹ کی مسلسل خاموشی کے بعد بولی:۔

بھابی جان! آپ بھی ایسا خیال کرتی ہیں، آپ سے
تو مجھے تو ایسی اُمید نہ تھی۔

نادرہ نے اس پر نورجہاں کو خوب ڈانٹا کہ زیادہ منطق نہیں چھانٹا کرتے جو کہہ دیا اُس پر عمل کرو، شریف بہو، بیٹیوں کو گھر والوں کے اشاروں سے سب کچھ سمجھ جانا چاہیئے۔ نورجہاں، اس پر چادر اوڑھ کر لیٹ گئی، اور اُس وقت جب کہ، خراٹے بھر رہی تھی، نورجہاں کی معصوم آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے،

شمشاد بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا، اور نورجہاں بھی نادرہ کی گفتگو کے بعد محتاط ہو گئی تھی، مگر بدگمانی، ہمیشہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی کوشش کرتی ہے، اور مشکوک نگاہ بعض وقت پھول کی پتی کی کور کو تلوار کی دھار سمجھنے لگتی ہے

ہماری معاشرت کے بہت سے حُزنیہ افسانوں کا موضوع یہی "بدگمانی" ہے۔ بدگمانی ایک ایسا پودا ہے، جو آبیاری کے بغیر ہی پھولتا پھلتا ہے، یہاں تک کہ اُس کے گھنی ڈالیاں تخیلات پر چھا جاتی ہیں۔

شمشاد کے گھر میں قدم رکھتے ہی نادرہ کی بدگمان نگاہیں، شمشاد اور نورجہاں کی حرکات وسکنات کی ٹٹول میں مصروف ہو جاتیں۔ وہ بغور دیکھتی تھی کہ کس انداز کیساتھ ہنس رہی ہے، اور شمشاد کن نگاہوں سے اُس کو دیکھ رہا ہے۔ نورجہاں جب کوئی چیز، شمشاد کو دیتی، تو نادرہ کی نگاہیں ہاتھ کی جنبش، اُنگلیوں کی حرکت، کلائی کے موڑ اور ہتھیلی کی گردش کو دیکھتیں

کسی کو کوئی چیز، خواہ کتنی ہی احتیاط سے دی جائے، ایک دوسرے کے ہاتھ مس ہو ہی جاتے ہیں، نورجہاں یا شمشاد کا ہاتھ اگر کبھی چھو جاتا، تو نادرہ یہی سمجھتی کہ یہ قصداً ایسا ہوا ہے۔ نورجہاں اگر کبھی کوئی شعر گنگنانے لگتی، تو نادرہ بہت غور کیساتھ سُنتی، اور شعر میں محبت کا لفظ سنتے ہی، شمشاد اُس کی نگاہوں کے سامنے آجاتا۔ یہی بیسروپا باتیں بدگمانی کی نشوونما کرتی رہتی ہیں۔

نادرہ نے کچھ دنوں تک تو افضل سے اپنے دل کی بات چھپائی، مگر آخر اُس سے نہ رہا گیا، ایک دن اُس نے باتوں باتوں میں، سرسری طور پر اپنی بدگمانی کا اظہار کردیا۔ اُس کی گفتگو کا انداز بہت زیادہ ہمدردانہ، سنجیدہ اور متین تھا، مگر افضل کے لئے یہہ سرسری باتیں بھی، بہت کچھ تھیں شمشاد اس کا بہت گہرا دوست تھا، لیکن نادرہ کی باتیں سُننے کے بعد اُس کے دل کی وہ گنجایش، جو شمشاد کے لئے وسیع تر ہوتی رہتی تھی، یکایک سمٹ گئی۔ افضل نے نورجہاں اور شمشاد کی پچھلی باتوں پر اب غور کیا، تو واقعات اور بدگمانیوں کی کڑیاں ملتی چلی گئیں، اُس نے اسی وقت شمشاد کا سامان مردانے حصہ میں بھجوادیا۔ شمشاد آیا تو اس تبدیلی کو دیکھ کر وہ متحیر ہوا۔ افضل نے اس پر بہت ہی بے پروائی کیساتھ کہا کہ مردانے میں ہی آپ زیادہ بے تکلفی کیساتھ رہ سکتے ہیں۔ شمشاد نے افضل کو سر سے پیر تک دیکھا، افضل کی بھویں تنی ہوئی تھیں، اور اب وہ بالکل بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ شمشاد نے باتیں شروع کیں تو افضل نے بعض باتوں کا جواب ہی نہیں دیا۔ ایک

آیا، مگر میرے خیال میں افضل اتنا کم ظرف نہیں ہے، آج وہ کسی
خاص وجہ سے متاثر تھا، بعض وقت آدمی کسی خاص صدمہ
اور فکر سے متاثر ہو کر، روکھی پھیکی باتیں کرنے لگتا ہے، ممکن
ہے صبح تک اُس کا موڈ (   ) بدل جائے،
رات کو سونے کے بعد، آدمی کے جذبات اور تاثرات میں
بہت کچھ تبدیلی ہو جاتی ہے، مگر مجھے اب قیصر پور چلا جانا
چاہیئے، وکیل، مختار مقدمات کی نوعیت سے واقف ہو گئے
ہیں، وہ خود کام کرتے رہیں گے، میری ضرورت ہوئی، تو قیصر پور
سے ایک دو دن کے لئے آجایا کروں گا ــــــــــــ

اپنے دل ہی دل میں، اس قسم کی باتیں کرتے کرتے اُسی نیند آ گئی۔
صُبح شمشاد ذرا دیر سے اُٹھا، حوائج سے فارغ ہو کر، نماز پڑھی، اتنے میں
افضل آ گیا۔ افضل کا چہرہ رات کے مقابلہ میں، اور زیادہ، خشمگیں
تھا اور اُس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔

افضل! میں آج قیصر پور جانا چاہتا ہوں،
اب مقدمات کی پیروی کی ضرورت نہیں رہی،
بھائی! آپ کو میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی۔ شمشاد نے کہا
آپ جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں ــــــ افضل نے بدلے
ہوئے تیوروں سے جوا
شمشاد کو اس قسم کے جواب کی افضل سے توقع نہ تھی، وہ افضل کا م

دیکھتا رہ گیا۔

میں اسی ٹرین سے جانا چاہتا' بھابی جان کو ذرا خبر کر دو'
وہ شکایت کریں گی کہ مجھ سے ملے بغیر ہی چلے گئے ـــــ شمشاد نے کہا
آپ کے تشریف لیجانیکے بعد آپ کا پیغام پہونچادیا جائیگا
آپ تو شمشاد صاحب بہت زیادہ طویل گفتگو کیا کرتے ہیں۔

شمشاد نے دیکھا کہ افضل ہر سیدھی بات کا جواب اُلٹا دیتا ہے' اور وہ غیر معمولی رُکھائی اور بے نیازی سے پیش آرہا ہے' اُس نے کمرے میں جا کر سامان درست کیا' ملازم کو بھیجکر تانگہ منگایا اور جب شمشاد تانگے میں بیٹھنے کے لئے بڑھا افضل اندر چلا گیا۔ شمشاد تانگے میں بیٹھ کر اسٹیشن پہونچا۔ اور پہلی ٹرین سے قیصر پور جا کر دم لیا۔

قیصر پور کے لوگوں کی تو عید ہو گئی۔ کئی مہینہ کے بعد شمشاد وطن واپس ہوا تھا' کئی دن تک متواتر لوگ اُس سے ملنے کے لئے آتے رہے' شمشاد کو یہ معلوم کرکے اطمینان ہوا کہ اُس کے پیچھے بھی بعض لوگوں نے تھوڑا بہت کام کیا۔ مخالفین کا زور بڑی حد تک کم ہو گیا تھا' مگر بعض شریر اور فتنہ پرداز اب بھی مورچہ جمائے ہوئے تھے۔ شمشاد اپنے اصلاحی پروگرام کو کامیاب بنانے میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ افضل کا سلوک چند دن تک اُس کے لئے سوہان روح کا باعث بنا رہا۔ مگر وہ اپنے کام میں اُس کو بھول گیا۔ بات یہ تھی کہ شمشاد دوستوں کی بدسلوکیاں بہت جلد بھول جاتا تھا' اُسکی فطرت کینہ کی سطح سے بہت بلند تھی۔

نامہ و پیام

محبت کی راہ میں جب رکاوٹیں پیش آتی ہیں، تو جذبۂ شوق اور زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔ آدمی اگر چاہے تو پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا سکتا ہے، مگر کسی انسان کے دل کے ایک گوشہ کو بھی اِدھر سے اُدھر نہیں کر سکتا۔ نظر اور زبان پر پابندی عاید کیجا سکتی ہے، مگر دل پر کوئی پہرہ نہیں بیٹھا سکتا۔ محبت کی اِسی کشمکش نے تاریخ کے بہت سے اوراق کو خونِ تمنا سے رنگین کر دیا ہے۔ محبت بالکل غیر اختیاری چیز ہے، آدمی اگر خود بھی کسی سے محبت کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا عقل محبت پر ہمیشہ خندہ زن رہی ہے، بات یہہ ہے کہ محبت کے کاروبار، عقل کی سمجھ میں نہیں آتے۔ عقل ہر چیز کو افادیت کے ایک خاص زاویہ نگاہ سے دیکھتی ہے، اور محبت کی دُنیا سود و زیاں کے تصور سے پاک ہوتی ہے، وہاں تو صرف اُچٹتی ہوئی نظر پہ دل و جان کو نچھاور کر دینے کے بعد بھی، اُس نگاہِ غلط انداز کی توجہ کا حق ادا نہیں ہوتا۔

اے کہ می پرسی چرا جامے بہ جانے میدہی
ایں سخن با ساقیٔ ما گو کہ ارزاں کردہ است

ایک مغربی شاعر نے تو محبت کو تو "خدا" تک کہہ دیا ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ محبت "زندگی" کا دوسرا نام ہے، اور جہاں حیات پائی جاتی ہے وہاں محبت بھی ضرور پائی جاتی ہے۔ اور محبت کا یہہ سلسلہ انسانوں سے گذر کر جانوروں اور نباتات تک پھیلا ہوا ہے۔

شمشاد کی جدائی نورجہاں کو بہت گراں گذری، اُس نے بہت کچھ ضبط کرنیکی کوشش کی، مگر دل کی بے تابی نے ضبط کے دامن کو اُس کے نازک ہاتھوں سے چھڑا دیا، اُس نے شمشاد کو قیصرپور کے پتہ پر کئی خطوط لکھے جس میں کبھی اشاروں اور استعاروں میں اور کبھی کھُل کر اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔ شمشاد نے کئی خطوں کا جواب نہیں دیا، پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اُسے اپنے کاموں میں سے فرصت نہ تھی، دوسرے وہ اس لئے کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا، اُس کا خیال تھا کہ جب خطوں کا جواب نُورجہاں کو نہ ملیگا، تو وہ خود ہی خاموش ہو جائیگی لیکن محبت کی دُنیا کا تو دستور ہی نرالا ہے، جفائیں اور زیادہ جذبہ کو مشتعل کرتی ہیں اور شوق کی آگ، بے مہریوں کے دامن کی ہوا سے ہی تیز ہوتی ہے۔ محبت میں اگر وفا کا جواب وفا سے دیا جائے، تو محبت صرف "فلسفہ" بن کر رہ جائے، یہاں تو زخم کھانے، رنج سہنے آہ وفغاں کرنے اور پامال وتباہ ہونے ہی میں لُطف آتا ہے،

دلِ غمگینِ ہلالی بہ جفائے تو خوش است

اے جفاہائے تو خوشتر ز وفائے دگراں

نورجہاں، شمشاد کے سکوت سے نااُمید نہیں ہوئی، خطوں کا سلسلہ برابر جاری تھا، شمشاد نے یہہ دیکھ کر کہ یہہ سیلاب بڑھا چلا آرہا ہے، کئی خطوں کا جواب ادا کیا۔ اُس کے ایک خط سے، اُسکی ذہنیت، اور اُس کے دوسرے خطوں کے مضمون کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عزیزہ نیک سیر ــــ!

اس قسم کی خط و کتابت تمہارے لئے کسی طرح زیبا نہیں، میں تم کو اس قسم کے خیالات سے بہت بلند سمجھتا ہوں، مگر شاید تم

مجھ سے مذاق کر رہی ہو! لیکن اس طرح کا مذاق بھی مناسب نہیں!
تمھارے لکھے ہوئے اشعار میری سمجھ میں نہیں آتے شریف لڑکیوں
کو شعر' شاعری سے اجتناب کرنا چاہیئے یقین ہے کہ تم اپنے
بڑے بھائی کا دوست سمجھ کر میری نصیحت پر عمل کروگی۔ خدا کیلئے
میرے نیک کام میں ایسے خطوط کو بھیجکر مشکلات پیدا نہ کرو۔ "شمشاد"

شمشاد نے اپنے اور افضل کے متعلق ایک لفظ بھی کسی سے نہیں کہا' لیکن یار لوگ
تو قیامت کے پر کالے ہوتے ہیں' اُن کو جب معلوم ہوا کہ شمشاد اور افضل کے تعلقات میں
پہلی سی گرمجوشی نہیں رہی' تو اُنھوں نے معاملہ کی ٹوہ لگانا شروع کی۔ اور شمشاد کے مخالف
افضل کے پاس آنے جانے لگے' افضل نے شمشاد کے متعلق اُن سے کچھ پوچھا' تو ان
لوگوں نے من گھڑت افسانے سنا کر' افضل کو اور زیادہ بدظن کر دیا۔ افضل نے
ان لوگوں کی باتیں سُن کر خدا کا شکر ادا کیا کہ شمشاد کا اُس کے گھر سے چلا جانا اچھا
ہوا' ورنہ یہہ دوستی رنگ لاتی۔

ہولناک اقدام

ایک دن افضل دوکان پر بیٹھا ہوا تھا' ہولی کا دن تھا' ہندو ہولی کھیل رہے
تھے' شہر کی گلیوں میں اُودھم مچ رہا تھا' آدمی تو آدمی دیواروں کو بھی عبیر و گلال سے
سُرخ بنا دیا تھا۔ کنواری لڑکیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں' پچکاریاں لئے ہوئے گھوم رہی
تھیں' بازار کھلا ہوا تھا' مگر گاہک بہت کم نظر آتے تھے' تماشائیوں کی کثرت تھی

افضل کا ملازم دوپہر کا کھانا دینے کے لئے دوکان پر آیا، اور کھانا رکھتے ہی چل دیا، ملازم مشکل سے دس بارہ قدم گیا ہوگا کہ افضل نے اُسے آواز دیکر بُلایا، اور غصہ کیساتھ بولا کہ تم نہایت نامعقول ہو، کھانا رکھتے ہی چل دئے، ملازم نے کہا کہ میں ابھی آتا ہوں بی بی نے مجھے ایک لفافہ دیا ہے کہ اِسے اسی وقت ڈاک خانہ میں ڈال دینا۔ افضل نے ملازم کے ہاتھ سے لفافہ لیلیا، اور شمشاد کا پتہ پڑھتے ہی، اُس کا چہرہ سُرخ ہوگیا، اُس نے لفافہ کو کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا۔ خط کا مضمون پڑھ کر، وہ غصہ کے مارے بید کی طرح کانپنے لگا، وہ اسی عالم میں بڑبڑانے لگا۔

شمشاد! دوستی کا خوب حق ادا کیا، مگر دوست، تیرے اس محبت کے قلعہ کو آج ہی مسمار کئے دیتا ہوں، شریف لوگ عزت کی خاطر سر کٹانا کھیل سمجھتے ہیں، کھیل افضل دوکان کے اندر آ گیا، اور بھرے ہوئے پستول کو، جو دوکان میں لٹکا ہوا تھا جیب میں رکھ کر، باہر آیا۔ اتنے میں ایک شخص جو قیصر پور کا رہنے والا تھا، افضل کی دوکان پر آ گیا، اور اُسکی زبانی معلوم ہوا، کہ شمشاد آج صُبح ہی قیصر پور سے آیا ہے، اور اسٹیشن کے قریب ہوٹل میں ٹھیرا ہوا ہے، کچھ ادھر اُدھر کی بات چیت کرنیکے بعد قیصر پور کا وہ آدمی چلا گیا، اور افضل نے عتاب آمیز مسکراہٹ کیساتھ کہا، شکار خود ہی آ گیا، پہلے مجھے اسی مردود کا جھگڑا ختم کر دینا چاہیئے۔ افضل کا چہرہ انتہائی بھیانک ہوگیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسکی آنکھوں میں کسی نے چنگاریاں بھر دی ہیں، دو ایک گاہک اُسی کی دوکان پر آئے تو اُس کے انداز دیکھ کر کپڑا مول لئے بغیر ہی چلے گئے۔

افضل نے شام ہی سے دوکان بڑھا دی، وہ دوکان سے سیدھا ہوٹل پہونچا بھرا ہوا پستول اُسکی جیب میں پڑا ہوا تھا، اور وہ ہوٹل کے زینہ پر تیز تیز چڑھ رہا تھا، ہوٹل کے ملازمین سے پوچھنے پر اُسے معلوم ہوا کہ شمشاد ابھی ابھی ٹیلے کے قریب کھیتوں میں ٹہلنے کیلئے چلا گیا ہے۔ افضل کا چہرہ

خوشی سے چمک اُٹھا کہ اب تو کوئی رکاوٹ ہی باقی نہیں رہی۔ وہ ہوٹل سے سیدھا ٹیلے کے قریب پہونچا، دن چھپ چکا تھا، ہرے بھرے کھیت جن کی کونپلوں کو ابھی ابھی سورج کی کرنیں چوم رہی تھیں، اب دھندلکے کی گود میں سونے کی تیاری کر رہی تھے۔ شمشاد گیہوں کے کھیت کی مینڈھ پر گنگناتا ہوا ٹہل رہا تھا، اور چھڑی سے پودوں کو ٹھوکے دیتا جاتا تھا۔ افضل ٹیلے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا، اور جب شمشاد اُس کے قریب آیا، تو اُس نے گولی چلا دی، شمشاد "ہائے میں مر گیا" کہہ کر دھڑام سے کھیت میں گر پڑا، اور افضل وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

کھیتوں میں کسانوں کی دو چار جھونپڑیاں تھیں، گولی کی آواز سُن کر کسان موقعہ پر دوڑے ہوئے آئے، شمشاد کھیت کی کیاری میں تڑپ رہا تھا۔ کسانوں نے ایک اُجلے پوش کو خاک و خون میں تڑپتے دیکھ کر، شور مچانا شروع کیا، اور آن کی آن میں بہت سے آدمی جمع ہو گئے شمشاد اب بیہوش ہو چکا تھا، لوگ اُسے اُٹھا کر دواخانے میں لے گئے۔ گولی سیدھے ہاتھ پر لگی تھی، بہت سا خون نکل جانیکے باعث شمشاد پر غشی طاری ہو گئی، ڈاکٹروں نے ہاتھ سے گولی نکالی، اور کہا کہ اس شخص کی زندگی تھی ورنہ اگر کہیں سینہ یا پیٹ پر ذرا ہٹ کر گولی لگ جاتی تو معاملہ ختم تھا، شہر میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی کہ ٹیلے کے قریب ایک شخص کو کسی نے گولی سے ہلاک کر دیا۔

افضل اپنی دانست میں شمشاد کو ہلاک کر چکا تھا، اُس کی آنکھوں سے سچ مچ خون برس رہا تھا، اُس نے گھر پہونچ کر چیختے ہوئے کہا، شمشاد کو تو میں نے موت کے گھاٹ اُتار دیا، اب او ننگِ خاندان نورجہاں! تیری باری ہے۔ نورجہاں برآمدے میں بیٹھی ہوئی چھالیاں کاٹ رہی تھی، اور اُس کی چوڑیوں کا نغمہ، فضا میں رقص کر رہا تھا، بھائی کی باتوں کو اُس نے پورے طور پر سُنا نہ تھا، کیوں کہ غصہ کے جوش میں افضل

سے پوری بات ادا نہ ہوتی تھی، لیکن ملازم نے چونکہ نورجہاں کے پوچھنے پر کہہ دیا تھا کہ افضل نے اُس کا دیا ہوا لفافہ اُس سے لیلیا، اس لئے بھائی کی اس خفگی کا سبب وہ سمجھ چکی تھی افضل زنانہ مکان کے صحن میں مہمل جملے کہتا ہوا داخل ہوا:۔

دونوں کا خون ۔۔۔! غیرت، شرافت ۔! نہیں چھوڑ سکتا، میں پھانسی ۔۔۔ ہاں! خوشی سے تیار ۔۔۔!۔۔۔

نورجہاں، اندر کمرے میں گئی، اور وہاں سے ایک لفافہ لیکر، جیسے ہی باہر آئی، افضل نے اُس پر فایر کر دیا۔ نورجہاں چکر کھا کر زمین پر گر پڑی ۔سب لوگ نورجہاں کو اُٹھانے کے لئے دوڑے، افضل کے ہاتھ میں پستول لگا ہوا تھا، اور وہ اُول خول بک رہا تھا۔ نورجہاں جب زمین پر گری ہے، تو اُس کے ہاتھ کا لفافہ، افضل کے قریب آکر گرا۔ افضل نے اُس لفافہ کو اُٹھا لیا۔ اور نورجہاں کے پُر اسرار خطوط سمجھ کر، لفافہ کے کاغذات پڑھنے لگا، اس لفافہ میں شمشاد کے وہ خطوط تھے، جو اُس نے نورجہاں کے خطوں کے جواب میں بھیجے تھے۔ وہ خطوط کو پڑھتا جاتا تھا اور اُس کا چہرے کا رنگ بدلتا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے آگ پر کوئی پانی چھڑک رہا ہے اور شعلوں کی بلندی، تدریجاً کم ہوتی جاتی ہے، وہ پاگلوں کی طرح چلا کر بولا:۔

بیگنا ہوں کے خون ۔! اب میں جی کر کیا کروں گا۔۔۔

یہہ کہکر اُس نے پستول کو اپنی طرف سیدھا کیا ہی تھا کہ ماما نے جو اس کے پاس کھڑی ہوی تھی۔ اُس کا ہاتھ تھام لیا، افضل نے ہاتھ کو جھٹکا دیا، اور گولی افضل کے پیر کو توڑتی ہوئی نکل گئی، افضل بھی برآمدے میں تڑپنے لگا، اور تھوڑی دیر میں

دونوں زخمیوں کو لوگ اُٹھاکر، اُسی دواخانے میں لے گئے، جہاں شمشاد پڑا ہوا تھا، نور جہاں کے بھی ہاتھ ہی میں گولی لگی تھی رات ہی میں ڈاکٹروں نے ان دونوں کی بھی مرہم پٹی کی۔ کئی دن تک ان تینوں زخمیوں کی یہہ حالت رہی کہ تھوڑی دیر کے لئے ہوش آگیا تو بہت دیر کے لئے بیہوش ہو گئے دوسرے ہفتہ میں حالت سنبھلنی شروع ہوئی۔ افضل کا زخم بہت جلد بھر گیا، اور جب اُسکی حالت سنبھل گئی۔ نور جہاں اور افضل کو الگ الگ وارڈوں میں رکھا گیا تھا، اور نور جہاں کی حالت سنبھلنے پر بھی، اُس سے شمشاد کے زخمی ہونے کے واقعہ کو چھپایا گیا۔ مگر جس دن شمشاد نے اُس کو دیکھنے کے لئے جانا چاہا اُس دن دواخانے کی نرس نے نور جہاں سے پورا واقعہ بیان کر دیا۔

شمشاد نے جب ڈاکٹروں سے کہا کہ وہ نور جہاں کو دیکھنے کے لئے جانا چاہتا ہے، تو اُنھوں نے سختی کیساتھ مخالفت کی، شمشاد بالکل بے بس تھا، یہہ دواخانے بھی بعض وقت قید خانے بن جاتے ہیں۔ اُس نے دواخانہ کے ملازم کے ہاتھ، نور جہاں کے پاس ایک پرچہ بھیجدیا، جس میں لکھا تھا:۔

ایک ہی نشانہ کے دو زخمی، اب ــــ

ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہو سکتے ــــ

نور جہاں کا زرد چہرہ، اس پرچہ کو پڑھکر گلاب کی طرح سُرخ ہو گیا۔ وہ آج سے زیادہ اپنی زندگی میں کبھی خوش نہیں ہوئی تھی۔

ماہر القادری